ماهنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

AUGUST - 1988

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحیم ہے

مسلمانوں سے عمومی اور ٹرسٹیان مساجد سے

خصوصی گذارش

احمد علی نور علی محمد (عطر والے)

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے قرآن مجید جیسی عظیم کتاب نازل فرمائی۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے چودہ سو سال پہلے دلوں کو ایمان کے نور سے روشن کر دیا تھا۔ قرآن کریم کی آیات سن کر حق کے بڑے بڑے دشمنوں کا دل پگھل جاتا تھا اور وہ اپنے رب کے آگے جھک جاتے تھے۔ یہی کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔

الحمد للہ اس کتاب کی ہم تلاوت بھی کرتے ہیں لیکن ہمارے دلوں پر اس کا کم اثر ہوتا ہے۔ عربی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے ہم اس کے حقائق و معارف کا پورا استفادہ کرنے سے محروم رہتے ہیں۔

قرآن کریم ہی سے ہمیں اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ یہ سمجھنے، غور و فکر کرنے اور عمل کرنے کی کتاب ہے لیکن افسوس کہ پانچ فی صد آدمی بھی ایسے نہیں ملے جو قرآن مجید کو ترجمے کے ساتھ پڑھتے ہوں۔ حافظ ہوں یا قاری، عام دین دار مسلمان ہوں یا مساجد کے مؤذن یا امام، کسی میں بھی یہ احساس نہیں پایا گیا کہ قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے کی کتاب ہے۔

دنیا کی شاید کوئی کتاب ایسی نہ ہوگی جسے لوگ بے سوچے سمجھے پڑھتے ہوں، پھر قرآن پاک کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں ہو کہ اسے بلا سمجھے بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری ہم سب پر بھی عائد ہوتی ہے۔ خصوصیت سے جو اہل علم ہیں۔

بقیہ ٹائٹل ۳ پر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۳ ——— شمارہ نمبر ۸

اگست ۱۹۸۸ء

● مدیر مسئول ——— نور محمد فلاحی

● مرتب ——— ولی اللہ سعیدی فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

سالانہ زرِ تعاون	۳۰ روپے
خصوصی تعاون	۱۰۰ روپے
غیر ممالک سے	۱۵ امریکی ڈالر
فی شمارہ	۳ روپے

پتہ ترسیل زر کا: دفتر ماہنامہ مجلہ حیات نو۔ جامعۃ الفلاح۔ بلریا گنج، اعظم گڈھ یوپی ۲۷۶۱۰۱

افضل نعیمی پریس برائے جمال پریس دہلی ——— کاتب: رفیق احمد رشیدی، کندھرا پور، اعظم گڈھ

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ

تعلیم نے انسان کو انسان بنایا	مرتب	۳

بحث ونظر

مولانا حمید الدین فراہیؒ کے بعض خیالات پر اعتراضات کا جائزہ	نسیم ظہیر اصلاحی	۶
ٹخنوں سے نیچے کپڑا پہننا	مفتی عبد الرؤف صاحب	۲۱
نوجوان وطلبہ تحریک کا میقاتی منصوبہ امکان کی روشنی میں	صباح الدین ملک فلاحی	۳۸

مقالات

سید قطب شہیدؒ کی قرآنی خدمات	عبید اللہ فہد فلاحی	۲۴

عظمت کے مینار

حواری ابو عبیدہ ابن جراحؓ	ابو جاوید	۲۸

تعلیم وتعلم

امام بخاری اور ابن حجر کی فتح الباری	ولی اللہ سعیدی فلاحی	۳۵

حلقۂ یاراں

[illegible]، طارق احسن فلاحی، عطا عابدی		۳۴

اخبار علمیہ

[illegible] سورہ فاتحہ کی اشاعت اور اس کی تقسیم		۵۹

شعر ونغمہ

غزل	صدا نیوتنوی	۲۷

جامعہ کے لیل ونہار

جامعہ کے [illegible] مولانا مودودیؒ کی پیش گوئی حرف بحرف صحیح	مرتب	۴۰

تعلیم نے انسان کو انسان بنایا

"تعلیم"[1] عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں علم حاصل کرنا۔ مفہوم تعلیم کی تعیین میں لوگوں کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تعلیم کا مفہوم علم حاصل کرنا ہے خواہ وہ کوئی بھی علم ہو اکیسا بھی ہو۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ تعلیم کا مطلب موجودہ زمانے کی مناسبت سے ترقی یافتہ رائج علوم کا حاصل کرنا ہے کیونکہ ایسے ہی علوم کے حاصل کرنے والوں کو تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے، اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ علم حاصل کرنا اس کو اپنی زندگی میں اتارنا اور خلق خدا کو فائدہ پہنچانا تعلیم کے مفہوم میں داخل ہیں۔ آج میں اس اداریے میں تعلیم کی تعریف (DIFINATION) پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا "تعلیم بس کچھ بول رٹ لینے یا چند باتیں جان جانے کا نام تو نہیں ہے بلکہ تعلیم اسے کہتے ہیں کہ آدمی جو ذہنی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے ان میں ترقی کا جتنا امکان ہو وہ اسے حاصل کرے۔ تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے۔ جس طرح انسان کا جسم ایک چھوٹے سے تخم سے شروع ہوتا ہے پھر مناسب غذا پاکر حرکت اور کام اور سکون وآرام سے طبیعیات اور کیمیا کے قانونوں کے مطابق کمال کے درجے کو پہنچتا ہے اسی طرح ذہن کا نشوونما بھی ذہنی غذا پاکر ذہنی قانونوں کے مطابق ہوتا ہے۔"[2]

ہم اپنے معاشرے میں بہت سے ایسے تعلیم یافتہ افراد دیکھتے ہیں جو جاہلوں سے بھی

---

[1] علم کی اہمیت اور ضرورت پر ناچیز مجلہ حیاتِ نو فروری ۱۹۸۸ء کے اداریے میں لکھ چکا ہے

[2] تعلیمی خطبات۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ص ۱۹

بدتر ہیں۔ وہ انسان بننے کے بجائے حیوان نظر آتے ہیں۔ نہ ان میں صحیح ڈھنگ سے سوچنے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی سنجیدگی سے کوئی کام کرنے کی قوت۔ غرضیکہ ان کے یہاں تعلیم کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ میرے اس سوال کا جواب ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا اقتباس میں موجود ہے کہ "تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پرورش و پرداخت کا نام ہے۔"

اس کی مزید وضاحت گاندھی جی کے اس نظریے سے ہوتی ہے[1] گاندھی جی نے اپنے خیال کے مطابق "سچی تعلیم" اس تعلیم کو کہا ہے جس میں ذہن، دل اور جسم تینوں کی تربیت کا خیال رکھا گیا ہو۔ ذہن اور جسم کی ہم آہنگ تربیت کے بارے میں انھوں نے ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

میرا عقیدہ ہے کہ ذہن کی صحیح تعلیم صرف جسمانی اعضاء مثلاً ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، ناک وغیرہ کی صحیح مشق اور تربیت کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بچے کے اندر جسمانی اعضاء کا صحیح استعمال ہی اس کے ذہن کی تربیت کا سب سے بہتر اور مؤثر طریقہ ہے۔ لیکن جب تک ذہن اور جسم کی نشوونما ساتھ نہ ہو اور روح کے ساتھ روح کی بیداری نہ آسکے، صرف ذہنی نشوونما ایک بھونڈی سی چیز ہوگی۔ روحانی تربیت سے میری مراد دل کی تعلیم ہے۔ اسلئے ذہن کی ایک صحیح و مکمل نشوونما صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ بچے کی جسمانی اور روحانی دونوں قوتوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہو اور سب سے مل کر ایک غیر منقسم کل بنتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ ان کی الگ الگ اور ایک دوسرے سے بے تعلق بھی تربیت ہو سکتی ہے۔

گاندھی جی نے سچی تعلیم کی ایک اور تعریف کی ہے۔ یہی نہیں کہ اس تعلیم میں ذہنی، جسمانی اور روحانی قوا کی ہم آہنگ تربیت کا خیال رکھا گیا ہو بلکہ ان کے نزدیک سچی تعلیم یہ ہے کہ جو لوگوں کی خدمت کا جذبہ پیدا کر سکے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تعلیم کی تعریف کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں "تعلیم دراصل کسی سماج کی جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لئے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور

[1] گاندھی جی کے تعلیمی خیالات۔ سعید انصاری۔ ص ۲۱

اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی کر سکیں۔"[1] گویا تعلیم یافتہ اس شخص کو کہیں گے جو ذہنی اعتبار سے نہایت پختہ ہو اور زمانے پر جس کی نظر ہو۔

سچ پوچھئے تو علم بھی ایک ذریعہ ہے خدا تک رسائی کا۔ عالم دنیا کو کہتے ہیں، اس کا مطلب ہوا علم باللہ یعنی جس سے اللہ تعالیٰ کو پایا جاسکے۔ علم بھی اس کا ایک ذریعہ ہے اور تعلیم اس علم کا حاصل کرنا ہے۔ گاندھی جی لکھتے ہیں: "ہماری زبانوں میں ایک بہت اچھا لفظ ہے جو طالب علم کے مترادف ہے اور وہ لفظ "برہمچاری" ہے۔ ودیارتھی ایک بنایا ہوا لفظ ہے اور وہ برہمچاری کا مترادف ہرگز نہیں ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ جانتے ہوں گے کہ برہمچاری لفظ کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی ہیں "خدا کا متلاشی"۔ ایک شخص جو اس طرح زندگی بسر کرے جس سے وہ کم سے کم وقت کے اندر خود کو خدا سے قریب کر دے۔"[2]

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں تعلیم کی اہمیت اور اس کا تعارف واضح ہو گیا ہے کہ تعلیم کا معنی محدود نہیں بلکہ علم کا حصول، اس پر عمل، علم کے مطابق ذہن کی ترقی اور ایک ایسے باشعور وجود کی تشکیل جو یقیناً چیزوں کی باریکیوں کو پالے اور جس سے خلق خدا کو فائدہ پہنچے۔ تعلیم کے مفہوم میں شامل ہیں۔ لہٰذا مندرجہ بالا صفات کا شمار انسانیت کے خواص میں ہوتا ہے۔ اور ان سے متصف انسان ہی کو انسان کہا جاسکتا ہے۔

انشاء اللہ آئندہ شماروں میں تعلیم، نصاب تعلیم اور ان کے متعلقات پر اور بہت کچھ لکھے جائیں گے۔ آپ کے مشوروں کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں علم حاصل کرنے، اس پر عمل کرنے اور خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ واللہ ولی التوفیق۔

[1] تعلیمی خطبات۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ص ۱۸

[2] ینگ انڈیا ۸ ستمبر ۱۹۲۷ء بحوالہ گاندھی جی کے تعلیمی خیالات۔ سعید انصاری۔ ص ۲۸

مولانا حمید الدین فراہیؒ کے بعض خیالات پر اعتراضات کا جائزہ

نسیم ظہیر اصلاحی غازی، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر

رمی جمار کی حقیقت

مقالہ میں تیسرا اعتراض "رمی جمار" کے بارہ میں کیا گیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"رمی جمار کے سلسلہ میں مشہور قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب قربانی کی نیت سے نکلے تو راستہ میں شیطان نے انھیں بہکانا چاہا، اس وقت انھوں نے اسے کنکریاں ماریں۔ رمی جمار اسی واقعہ کی یادگار ہے لیکن مولانا فراہیؒ کا کہنا ہے کہ یہ اس واقعہ کی یادگار ہے کہ اہل مکہ نے ابرہہ کا مقابلہ کیا تھا اور کنکریاں ماری تھیں۔ فرماتے ہیں:

بہت سے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ منیٰ میں "رمی جمرہ" واقعۂ فیل ہی کی یادگار ہے۔ انھوں نے اپنے نظریہ کے بہت سے وجوہ بیان کئے ہیں ہم ذیل میں انھیں اختصار کے ساتھ بیان کریں گے اور ساتھ ہی ان کا علمی جائزہ لیں گے۔"

اس اعتراض کا جائزہ لینے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ قربانی، جس کے بارہ میں مسلمانوں کا عام خیال یہ ہے کہ وہ "منیٰ" میں پیش آیا تھا، در حقیقت "مروہ" یا اس کے قریب کسی جگہ پیش آیا تھا۔ تاریخ و تفسیر کی کتابوں میں مقام قربانی کے سلسلہ میں متعدد جگہوں کا نام لیا گیا ہے۔ چنانچہ امام شوکانی کی فتح القدیر میں ہے:

قد اختلف في موضع الذي اراد ذبحه فيه فقيل مكة في المقام وقيل في المنحر بمنى عند الجمار وقيل على الصخرة التي باصل جبل ثبير وقيل بالشام۔ [1]

وہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے لخت جگر کو ذبح کرنا چاہا تھا اس کے بارہ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ جگہ مکہ میں مقام ابراہیم ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ جگہ منیٰ میں جمرات کے پاس ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ وہ ثبیر پہاڑ کے نیچے چٹان پر پیش آیا تھا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ شام میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

بعض دوسری کتابوں میں اور مقامات کے نام بھی ملتے ہیں لیکن تورات سے صراحۃً اور قرآن مجید سے اشارۃً اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی اصل قربان گاہ خانۂ کعبہ یا اس کے ارد گرد ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب "ذبیح کون ہے" میں یہود کے اس دعویٰ کو کہ "واقعۂ قربانی یروشلم میں ہیکل سلیمان یا جبل جریزیم پر پیش آیا تھا" خود تورات کی روشنی میں غلط قرار دیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اصل قربانگاہ "مروہ" ہے جو بیت اللہ کے قریب واقع ہے اور مسلمانوں اور اہل کتاب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ "اب بھی قربان گاہ بیت اللہ کے پاس ہے" جب کہ منیٰ بیت اللہ سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر ہے۔[2] ذیل میں مولانا کی تحقیق کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

"تورات میں قربان گاہ کا جو موقع بتایا گیا ہے وہ "مریہ، موریہ یا مورہ" ہے۔ یہود کا خیال ہے کہ یہ یروشلم میں وہ جگہ ہے جہاں ہیکل سلیمانی ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہ وہ مقام ہے جہاں مسیح علیہ السلام کو سولی دی گئی تھی۔ لیکن خود ان کے محققین کے نزدیک یہ دعویٰ بالکل بے اصل ہے۔"

چنانچہ اس کے ثبوت میں اسٹانلی کی مندرجہ ذیل تحقیق پیش کی ہے:

"یہود مدعی ہیں کہ یہ مقام یروشلم میں، جبل "موریا" پر ہے لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ یہ مقام قبر مقدس کے کنیسہ کے قریب ہے۔ لیکن یہ دعویٰ پہلے دعویٰ سے بھی زیادہ بے بنیاد ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ یہ مقام مکہ میں جبل عرفات پر ہے ان کا دعویٰ سب سے زیادہ عجیب اور بے حقیقت ہے۔ سب سے لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ اس مقام کو جبل جریزیم پر تلاش کیا جائے، وہ شکلاً بھی قربان گاہ سے بہت ملتا جلتا ہوا ہے۔"[3]

اس کے بعد مولانا نے اسٹانلی کی "جبل عرفات" والی بات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ جغرافیہ نبا اللہ کے اصلاحی اصول و قواعد کی روشنی میں ان اسباب و علل کو واضح کرتے ہوئے جن کی بنا پر مروہ

---

[1] شوکانی ـــ فتح القدیر ۴/ص۴۰۳ دار الفکر

[2] محمد رابع ندوی ـــ جزیرۃ العرب ص۲۳۳ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس آفیسٹ

[3] مولانا فراہیؒ ـــ "ذبیح کون ہے" ص۴۳ تا ۵۲ تلخیص

"مریا" "موریۃ" یا "موریہ" وغیرہ بن گیا، یہ بتایا ہے کہ اصل لفظ مروہ ہے۔ پھر انھوں نے بہت مدلل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس مقام کے جو اوصاف تورات میں بیان ہوئے ہیں وہ حرف بحرف "مروہ" پر منطبق ہوتے ہیں جب کہ ہیکل سلیمانی، قبر مقدس کا کنیسہ اور جبل جرزیم پر کسی طرح صادق نہیں آتے۔

مولانا نے اپنے مذکورہ دعوی پر احادیث صحیحہ اور آیات قرآنی سے بھی استدلال کیا ہے اور اس اشکال کا جواب بھی دیا ہے کہ اگر تاریخی طور پر "مروہ" کا موقعۂ ذبح ہونا ثابت ہے تو پھر منیٰ میں قربانی کیوں کی جاتی ہے؟ اس بحث کا ماحصل یہ ہے:

"حدیث صحیح میں وارد ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مروہ کے پاس قربانی کے جانوروں کو کھڑے دیکھا تو مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ هذا المنحر وكل فجاج مكة منحر وطرقها منحر۔ یعنی یہ اصل قربانگاہ ہے اور مکہ کے تمام رستے قربانی کی جگہیں ہیں۔ ایک مرتبہ منیٰ کی بابت ارشاد فرمایا کہ "هو منحر" یعنی یہ قربانی کی ایک جگہ ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے الفاظ پر غور کرو۔ آپ مروہ کی نسبت "المنحر" کا لفظ استعمال فرماتے ہیں یعنی یہ اصل قربانگاہ ہے، اور دوسرے مقامات کی بابت تنکیر کے ساتھ صرف "منحر" کا لفظ استعمال فرماتے ہیں یعنی یہ بھی قربانی کی جگہیں ہیں۔ ہمارے دعوی پر قرآن مجید کے ایک اور پہلو سے بھی روشنی پڑتی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قربانی کے جانوروں کے باب میں حکم دیا ہے کہ "ثم محلها الى البيت العتيق" (پھر ان کو قدیم گھر کے پاس پہنچانا ہے) نیز فرمایا "هديا بالغ الكعبة" یعنی قربانی کے جانوروں کو کعبہ کے پاس پہنچانا ہے کیونکہ ان کے ذبح ہونے کی جگہ اسی بیت قدیم کے پہلو میں ہے جس کو اللہ نے اس مقصد کے لیے سب سے پہلے بنایا جیسا کہ ایک اور مقام پر اس کی تصریح ہے (آل عمران ۹۶) [1]

مروہ خانۂ کعبہ کے پہلو میں واقع ہے اور وہی پہلی قربانگاہ ہے لیکن بعد میں جب امت کا دائرہ وسیع ہوا تو قربانگاہ کے دائرہ میں بھی وسعت پیدا کر دی گئی۔ اہل کتاب میں اور ہم میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ اول بھی قربانگاہ بیت اللہ کے پاس ہے جیسا کہ پیدائش (۲۲: ۲-۹) میں ہے۔" [2]

---

[1] ایضاً صفحہ ۵۵ — [2] ایضاً۔ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی مروہ ہی کو قربانگاہ قرار دیا ہے اور مذکورہ اعتراض کا جواب بھی وہی دیا ہے جو مولانا نے دیا ہے۔ دیکھئے: سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۳۱، ج ۵ ص ۲۳۵-۲۳۶

جب یہ ثابت ہو گیا کہ اصل قربانگاہ "مروہ" ہے نہ کہ منیٰ، تو پھر منیٰ کے سلسلہ میں قربانی کے تعلق سے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ سب بے بنیاد ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ چنانچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

"عام طور سے مشہور یہ ہے کہ کنکریاں مارنے کا یہ فعل، اس واقعہ کی یادگار میں کیا جاتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پیش آیا تھا؛ یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی دیتے وقت شیطان نے آکر آپ کو بہکایا تھا اور آپ نے اسے کنکریاں ماری تھیں۔ یا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فدیہ میں مینڈھا آپ کو قربانی کے لئے دیا گیا تو وہ نکل کر بھاگا تھا اور اس کو آپ نے کنکریاں ماری تھیں۔ لیکن کسی صحیح حدیث میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت نہیں ہے کہ "رمی جمار" کی علت یہ ہے۔" [1]

مذکورہ بالا تصریحات کے بعد مقالہ نگار کے تمام اعتراضات بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں تاہم چونکہ ان کے مضمون سے مولانا کے بارہ میں متعدد غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے اسلئے ان کے ان اعتراضات کی نوعیت پر بھی غور کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مولانا فراہی نے لکھا ہے:

"حج اور اس کے تمام مناسک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے چلے آرہے ہیں چنانچہ کلام جاہلیت میں اجمالاً و تفصیلاً ان باتوں کا ذکر موجود ہے .... حج سے متعلق ساری چیزوں کا ذکر آپ کو شعرائے جاہلیت کے اشعار میں مل جائے گا لیکن "رمی جمار" کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی چیز ہے، اور واقعہ فیل کے بعد وجود میں آئی ہے۔" [2]

مولانا کے مذکورہ دعوی پر نقد کرتے ہوئے صاحب مقالہ لکھتے ہیں:

"کلام جاہلیت میں رمی جمار کا مذکور نہ ہونا اس بات کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے کہ یہ واقعہ فیل کی یادگار ہے۔ اگر حج کے دوسرے مناسک حضرت ابراہیم ؑ کے زمانہ سے چلے آرہے تھے اور رمی جمار کا اضافہ واقعہ فیل کی اہمیت کے پیش نظر کیا گیا تو یہ ایک غیر معمولی فعل تھا جس کا اشارہ بعد کے شعراء کے کلام میں ضرور ملنا چاہئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عہد اسلام کے شعراء کے

---

[1] مولانا مودودی، خطبات ۲/۳۲-۴۰ بحواشیہ، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۷۲ء

[2] مولانا فراہی "تفسیر سورۂ فیل" صفحہ ۸۸-۸۹

کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہ رمی جمار کا واقعۂ فیل سے ادنیٰ سا بھی تعلق ہے بلکہ نثری تحریروں اور تاریخی روایتوں میں بھی اس سلسلہ میں ادنیٰ سا اشارہ نہیں ملتا۔

مقالہ نگار کی پوری گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے نقطۂ نظر کی تمام تر بنیاد محض اسی بات پر ہے کہ "کلام جاہلیت میں رمی جمار کا کوئی ذکر نہیں ہے" حالانکہ مولانا نے متعدد دوسرے قرائن کی بنیاد پر اس نقطۂ نظر کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ خود صاحب مقالہ نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح کیا ہے: "فرماتے ہیں کہ بہت سے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ رمی جمار واقعۂ فیل ہی کی یادگار ہے۔ انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کے بہت سے وجوہ بیان کئے ہیں۔"

انہی وجوہ و قرائن میں سے ایک قرینہ اور وجہ یہ بھی ہے کہ "کلام جاہلیت میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے" جبکہ دوسرے تمام مناسک حج کا ذکر موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ محض کلام جاہلیت پر کسی چیز کا ثبوت یا عدم ثبوت منحصر نہیں ہے تاہم اس کی اہمیت سے بالکل انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اشعار جاہلیت کو عربوں کی تاریخ (دیوان) کہا جاتا ہے[1] بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک فرمایا ہے۔

عن ابن سیرین قال قال عمر بن الخطاب کان الشعر علم قوم لم یکن لهم علم اصح منه[2]	شعر ایک ایسی قوم کا علم ہے جس کے یہاں اس سے زیادہ صحیح کوئی دوسرا علم نہیں تھا۔

اس لئے حج اور مناسک حج کی تاریخی و مذہبی اہمیت کے پیش نظر یہ بات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ کلام جاہلیت میں تمام مناسک کا ذکر تو ہو مگر کسی ایک خاص اور اہم رکن کا ذکر کہیں نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ اگر رمی جمار واقعۂ فیل کی یادگار ہے تو اس کا ذکر بعد کے شعراء کے یہاں ہونا چاہئے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ بلاشبہ اس کا ذکر بعد کے شعراء کے یہاں موجود ہے مگر اس کی صراحت نہیں ہے کہ یہ کس چیز کی یادگار ہے؟ کیونکہ شعراء کے کلام میں اتنی تفصیل نہیں ہوتی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابو رغال کی قبر پر سنگساری کا ذکر تو شعرائے عرب اپنے اشعار میں کرتے ہیں لیکن اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کرتے۔ اسی طرح بعض نثری تحریروں اور تاریخی روایتوں میں

[1] محمد سلام الجمحی۔ طبقات الشعراء ص ۱۲ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۸۸ء
[2] ایضاً ص ۱۰

بھی اس کا ثبوت موجود ہے کہ رمی جمار سنت ابراہیمی نہیں ہے بلکہ بعد کا اضافہ ہے جیسا کہ ہم آگے اس کی وضاحت کریں گے۔

مولانا کے مذکورہ دعوے پر کہ "کلام جاہلیت میں رمی جمار کا کوئی ذکر نہیں ہے" صاحب مقالہ کا کہنا ہے کہ "جاہلیت کے بعض اشعار میں بھی رمی جمار کا اشارہ ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اسلام سے پہلے حج میں رمی جمار کرتے تھے۔ اس کے ثبوت میں یہ اشعار نقل کئے گئے ہیں:

فاقسم بالذی قد کان ربی ، وانصاب لدی الجمرات المغر

میں قسم کھاتا ہوں اس ذات کی جو میرا رب ہے اور ان منصوب بتوں کی جو جمرات کے پاس ہیں

دورکهم شعث النواصی کانهم ، سوابق حجاج توافی المجمرا

اس نے ان کو جالیا، اس حال میں کہ ان کی پیشانی کے بال پراگندہ اور غبار آلود تھے گویا وہ حجاج ہوں جو سب سے پہلے رمی جمار کی جگہ پہنچ گئے ہوں۔

یہ دونوں اشعار ڈاکٹر جواد علی کی کتاب "المفصل" سے نقل کئے گئے ہیں۔ ان کے متعلق عرض ہے کہ پہلا شعر دور اسلام کا ہے جو جنگ بدر کے بعد مقتولین قریش کا مرثیہ کہتے ہوئے کہا گیا ہے جیسا کہ ابن ہشام میں صراحت موجود ہے[1] اس لئے اس سے دور جاہلیت پر استدلال صحیح نہیں۔ حضرت ابو طالب کے بعض اشعار نقل کرنے کے بعد خود صاحب مقالہ نے لکھا ہے کہ:

"اگرچہ یہ قصیدہ مکی دور کے اس زمانہ کا ہے جب مشرکین کی مخالفت شدت اختیار کر چکی تھی اس لئے اس سے عہد جاہلیت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔"

جب مکی دور میں حضرت ابو طالب کے اشعار سے استدلال صحیح نہیں ہے تو مدنی دور میں جنگ بدر کے بعد کے اشعار سے استدلال کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

دوسرا شعر حذیفہ بن انس ہذلی کا بتایا جاتا ہے جیسا کہ لسان العرب وغیرہ میں بھی ہے[2] لیکن حذیفہ ایک مجہول شاعر ہے۔ اس کا کوئی تذکرہ و ترجمہ راقم کو نہیں مل سکا اس لئے اس سے بھی

[1] ابن ہشام ج ۲، ص ۳۳-۳۵ جدید محقق نسخہ
[2] ابن منظور۔ لسان العرب ج ۸ ص ۱۴۲، مادہ ج م ر، دار صادر بیروت

استدلال صحیح نہیں۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ کلام جاہلیت میں بھی رمی جمار کا ذکر موجود ہے جیسا کہ "احمسیات" وغیرہ کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے۔ تب بھی اس سے کوئی خاص اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ یہ رسم سو سال یا کم از کم چالیس سال قبل اسلام سے عربوں میں جاری تھی۔[1] اس لئے اس کا ذکر ضرور ہونا چاہئے۔ صاحب مقالہ نے مزید لکھا ہے کہ:

"ایسا بھی نہیں ہے کہ عہد جاہلیت میں رمی جمار کا ثبوت نہ ملتا ہے، اس سلسلہ میں جب ہم تاریخ کی کتابوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو ہمیں رمی جمرات کا تذکرہ ملتا ہے۔ چنانچہ متعدد مورخین نے صراحت کی ہے کہ اہل عرب جاہلیت میں "رمی جمرات" کرتے تھے۔"

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ بلاشبہ عہد جاہلیت میں رمی کے ثبوت کی صراحت بعض مؤرخین نے کی ہے[2] لیکن انہی مورخین نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ ان کی "رمی" دور ابراہیمی کی کوئی بچی کھچی ہوئی یادگار نہ تھی جس کو اسلام نے ترمیم و ترجیح دیا ہو بلکہ اسلام سے برسوں یا ایک صدی پہلے "عمر بن لحی" کے ذریعہ اس کی بنیاد پڑی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر جواد علی نے اپنی کتاب "المفصل" میں یہ تصریح کی ہے:

ویرجع اھل الاخبار مبدأ رمی الجمرات الی عمرو بن لحی، فیذکرون انه جاء بسبعة اصنام فنصبها بمنی عند مواضع الجمرات، و علی شفیر الوادی و مواضع اخری و قسم علیها حصی الجمار

مورخین عمرو بن لحی کو رمی جمار کا بانی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ سات بت لایا اور منی میں جمرات کے پاس، وادی کے کنارہ اور بعض دوسرے مقامات پر نصب کیا اور پھر ان پر اکیس کنکریوں کو تقسیم کیا چنانچہ ہر بت پر تین کنکریاں ماری جاتی تھیں۔

---

[1] واقعہ فیل کے بارہ میں متعدد اقوال ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے سو سال قبل یہ واقعہ پیش آیا تھا مگر مشہور یہ ہے کہ آپکی پیدائش کے سال ہی یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ علامہ سید آلوسی نے روح المعانی میں [illegible]۔

[2] صاحب مقالہ نے ڈاکٹر جواد علی کی کتاب "المفصل"، ڈاکٹر شوقی ضیف کی "العصر الجاہلی" اور محمد لبیب البتنونی کی "الرحلة الحجازية" کا حوالہ دیا ہے۔

احدی وعشرین حصاة فیرمی کل صنم بثلاث حجرات[1]

ہمارے خیال میں ڈاکٹر جواد علی نے اس موضوع پر سب سے زیادہ تفصیل اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے باقی لوگوں نے محض سرسری طور پر اس کا ذکر کر دیا ہے[2] جس سے عربوں کی اس "رمی" کی کوئی تفصیل سامنے نہیں آتی۔ ڈاکٹر جواد علی کی تحقیقات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ رمی جمرات کا موجودہ تصور اور مناسک حج میں اس کا اضافہ بعد کی چیز ہے۔[3] فاضل مقالہ نگار نے ڈاکٹر موصوف کی بیان کردہ تفصیل کی تردید کی ہے لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اگر رمی یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت اور ان کی کوئی یادگار ہوتی تو مورخین ضرور اس کی تصریح کرتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مناسک حج کی تاریخ پر جو کچھ لکھا گیا ہے ان جملہ مناسک کے بارے میں یہ تصریح موجود ہے کہ وہ اس دور میں کیسے ادا کئے جاتے تھے، ان میں کیا کیا چیزیں مروج تھیں اور جاہلی اعتقادات کی بنا پر داخل ہو گئی تھیں، ان کے بارے میں عربوں کے خیالات و تصورات کیا تھے۔ لیکن "رمی جمار" کا کہیں کوئی ذکر یا کوئی تفصیل کم از کم راقم کی نظر سے نہیں گزری جس سے اسی خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ بعد کا اضافہ ہے۔

ہمارے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جزیرۂ عرب بت پرستی کی [illegible] اور اس کی

---

[1] الدکتور جواد علی، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۶ ص ۳۸۳ مکتبۃ النہضۃ، بغداد ۱۹۸۰ء

[2] چنانچہ ڈاکٹر شوقی ضیف نے صرف یہ لکھا ہے کہ "وکان من تقالیدھم رمی الجمرات بمنی" دوسری کتابوں میں بھی ایسے ہی بعض چند الفاظ ہیں۔ محمد لبیب البتنونی کی کتاب راقم کو دستیاب نہ ہوسکی۔

[3] ڈاکٹر جواد علی کی بیان کردہ تفصیل صاحب مقالہ کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"ڈاکٹر جواد علی نے لکھا ہے کہ "کنکریاں مارنے کو رمی جمرات یا رجم کہتے ہیں۔۔۔۔ جاہلیت میں بھی رجم کا تصور پایا جاتا تھا۔ لیکن وہ اسلامی تصور سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام میں رجم ان لوگوں کو کیا جاتا ہے جو شریعت کے منافی کوئی عمل کرتے ہیں جبکہ جاہلیت میں رجم احترام و تعظیم کے لئے ہوتا تھا۔ اہل عرب جب کسی قبر یا کسی جگہ پر رجم کرتے تھے تو اس سے ان کی مراد اسکی تعظیم ہوتی تھی جبکہ مسلمانوں کے نزدیک اس سے تحقیر مقصود ہوتی ہے۔۔۔۔ جاہلیت میں اہل عرب نے متعدد جمرات بنا رکھے تھے جن کا وہ طواف و زیارت کیا کرتے تھے شاید وہ بتوں کی جگہ یا مقدس مقامات یا اکابر و آباء و اجداد کی قبریں ہوں۔ اہل عرب ان پر احترام و تعظیم کے طور پر کنکریاں مارتے تھے۔"

ترویج کا ذکر کرتے ہوئے تقریباً سبھی مورخین لکھتے ہیں کہ گو جزیرۃ العرب بت پرستی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور پورا دین ابراہیمی مسخ ہو چکا تھا تاہم ان کے اندر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ کی بعض یادگار چیزیں باقی رہ گئی تھیں۔ پھر جب ان یادگاروں کو شمار کراتے ہیں تو کوئی بھی مورخ "رمی جمار" کا ذکر کرتے ہوئے نظر نہیں آتا۔ مثلاً علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

قال ابن اسحاق[1] واستبدلوا بدين ابراهيم واسماعيل فعبدوا الأصنام وصاروا الى ما كانت عليه الامم قبلهم من الضلالات وفيهم على ذلك بقايا من عهد ابراهيم عليه السلام يتمسكون بها من تعظيم البيت والطواف والحج والعمرة والوقوف على عرفات والمزدلفة وهدى البدن والاهلال بالحج والعمرة مع ادخالهم ما ليس فيه [2]

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عرب والوں نے دین ابراہیم و اسمٰعیل کو بدل ڈالا چنانچہ وہ بتوں کی پرستش کرنے لگے اور ان گمراہیوں میں جا پڑے جن میں گزشتہ قومیں مبتلا تھیں تاہم ان میں دور ابراہیم کی کچھ یادگاریں باقی رہ گئی تھیں جنھیں وہ مضبوطی سے اختیار کئے ہوئے تھے مثلاً بیت اللہ کی تعظیم اور اس کا طواف، حج، عمرہ، عرفات و مزدلفہ میں ٹھہرنا، قربانی اور حج و عمرہ کی تکبیر و تہلیل۔ گو ان میں کچھ نئی بھی چیزیں داخل کر دی گئی تھیں جن کا اصل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

اسی طرح ازرقی نے بھی "تاریخ مکہ" میں چند ایسی روایتیں نقل کی ہیں جن سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

عن ابن خثيم قال: سألت ابا الطفيل قلت هذه الجمار ترمى منذ كانت الاسلام، كيف لا تكون هضباً تسد الطريق؟ فقال ابو الطفيل: سألت

ابن خثیم سے مروی ہے کہ میں نے ابو الطفیل سے پوچھا کہ آغاز اسلام سے یہ کنکریاں ماری جاتی ہیں آخر کیا وجہ ہے کہ یہ جمع ہو کر پہاڑ نہیں بن جاتیں جس سے راستہ بند ہو جائے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ

[1] ہم نے ابن اسحٰق کی روایت بالقصد نقل کی ہے کیونکہ ہمارے مخالفین کے نزدیک وہ ثقہ اور قابل اعتماد راوی ہیں۔
[2] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۰۸، طبع ثالث ۱۹۷۹ء۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۷۸-۷۹ جدید محقق نسخہ

عنهما ابن عباس فقال: ان الله تعالى وكل بها ملكا فما تقبل منه رفع وما لم يتقبل منه ترك [1]

سے اس کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو مامور کر رکھا ہے جو قبول ہو جائیں انھیں اٹھا لیا جائے اور جو قبول نہ ہوں انھیں چھوڑ دیا جائے۔

ایک دوسری روایت میں جو سعید بن جبیرؓ اور ابن عمرؓ تک پہنچتی ہے، مذکورہ سوال اس طرح کیا گیا ہے:

أُخبرت أن نفيعا كان جالسا عند ابن عمر اذ قال له رجل: يا ابا عبد الرحمن ما كنا نترايا في الجاهلية من الحصى والمسلمون اليوم أكثر ثم انه لضحضاح؟ فقال ابن عمر: انه والله ما قبل الله من امرئ حجة إلا رفع حصاه [2]

مجھے بتایا گیا ہے کہ نفیع ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے ابن عمرؓ سے سوال کیا کہ اے ابو عبد الرحمٰن دور جاہلیت میں تو ہم کنکریوں کا یہ سلسلہ نہیں دیکھتے تھے لیکن آج مسلمان تو خوب کنکریاں مارتے ہیں مگر پھر بھی وہاں گڑھا ہی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ بخدا جس شخص کا حج قبول ہو جاتا ہے اس کی کنکریاں اٹھالی جاتی ہیں۔

بعض روایات میں تو اس طرح کے سوالات بھی قائم کئے گئے ہیں کہ "رمی جمار" کا آغاز اسلام کے بعد ہوا ہے یا قبل اسلام؟ [3] مولانا مودودی علیہ الرحمۃ نے تو صراحت کی ہے کہ یہ واقعہ فیل ہی کی یادگار ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"دوسرے دن پتھر کے ان تینوں ستونوں پر باری باری کنکریوں سے پھر چاند ماری کرتا ہے جن کو جمرات کہتے ہیں اور جو دراصل اس ہاتھی والی فوج کی پسپائی اور تباہی کی یادگار ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سال

[1] ابو الولید ازرقی، اخبار مکہ ج ۲ ص ۱۷۵، الطبع الرابع، مطابع دار الثقافہ مکہ ۱۹۸۳ء
[2] ایضاً۔ ایک روایت میں "فی الجاہلیۃ والاسلام" کے بھی الفاظ ہیں مگر ظاہر ہے کہ مذکورہ دونوں روایتوں کی موجودگی میں یا تو وہ روایت صحیح نہیں یا پھر "جاہلیت" سے واقعہ فیل کے بعد کا زمانہ مراد ہے۔
[3] علامہ جلال الدین السیوطی، الدر المنثور ج ۱

عین حج کے موقع پر اللہ کے اس گھر کو ڈھانے آئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "[1]

لیکن شیطان کو کنکریاں مارنے والا خیال شاید اس لئے عام ہو چلا گیا کہ چونکہ واقعۂ فیل موسم حج میں پیش آیا تھا اور اسی مناسبت سے یہ رسم بھی حج ہی کے موقع پر ادا کی جاتی رہی، اس لئے اس کو بھی دوسرے مناسک حج کی طرح ابراہیمی یادگار تصور کیا جانے لگا اور پھر اسکی ایک وجہ بھی تلاش کر لی گئی۔

مولانا فراہیؒ نے لکھا ہے کہ "یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ اصحاب الفیل پر سنگباری وہیں ہوئی تھی جہاں رمی کی سنت ادا کی جاتی ہے"[2] اور معترض کا کہنا ہے کہ "لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رمی کی سنت وہیں ادا ہوتی ہے جہاں اصحاب الفیل پر سنگباری ہوئی تھی" صاحب مقالہ کی یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ انھوں نے اپنے اس مطلق انکار کی کوئی وجہ نہیں بیان کی جبکہ مولانا فراہیؒ نے کئی صفحات میں اس پر تفصیل سے لکھ کر اپنے مذکورہ دعوی کو ثابت کیا ہے[3] اور بچشم خود اس مقام کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں صاحب مقالہ نے جتنی دوسری باتیں بھی لکھی ہیں جو چنداں لائق اعتناء نہیں۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

"اگر رمی کی اصل وہ ہوتی جو لوگوں نے سمجھی ہے، یعنی شیطان کو سنگباری کرنا، تو قربانی، رمی سے فارغ ہونے کے بعد تیسرے یا چوتھے دن ہونی چاہئے تھی حالانکہ قربانی رمی کے پہلے ہی دن ہوتی ہے پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شیطان دوسرے اور تیسرے دن کیوں سنگسار کیا جاتا ہے؟"[4]

مذکورہ عبارت نقل کرنے کے بعد فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ رمی کی سنت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی یادگار ہونے کے لئے ہر چیز میں اس کی مماثلت ضروری نہیں ہے۔ یہ معلوم ہے کہ قربانی پہلے دن رمی کے بعد ہوتی ہے اور نفس واقعہ کے اثبات کے لئے یہ کافی ہے۔ علامہ موصوف کے نزدیک صفا و مروہ کے درمیان سعی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سرگرمی کی یادگار ہے جو انھوں نے قربانی کے لئے صفا کی طرف سے مروہ چلتے ہوئے دکھائی تھی۔ جو اعتراض انھوں نے بیان کیا ہے وہی اعتراض وہاں ان پر بھی ہوتا ہے کہ

---

[1] مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ: تفہیمات سورۃ النجم ص [illegible] مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۷۸ء

[2] مولانا فراہیؒ: تفسیر سورۂ فیل ص ۳۵-۳۶ [3] ایضاً ص ۹۲تا۹۶ [4] ایضاً ص ۴۲

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب ایک بار صفا سے مروہ کی طرف گئے تھے تو آخر یہ صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کیوں کی جاتی ہے؟"

یہ اعتراض محض خیالی اور الزامی ہے ورنہ یہ بالکل واضح ہے کہ رمی جمار اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہر طرح واقعۂ فیل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اس لئے یہ کہہ کر کہ "ہر چیز میں مماثلت ضروری نہیں ہے" انکار کر دینا کسی طرح صحیح نہیں۔ جہاں تک "سعی بین الصفا والمروۃ" کا سوال ہے تو اسکو ایک بار کے بجائے سات بار اسلئے کیا جاتا ہے کہ اس سے ایک خاص جوش و جذبہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے (جیسا کہ سعی پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی کا خیال نقل کیا تھا) اور ایک مرتبہ سے اس جذبہ کی تسکین نہیں ہو سکتی تھی۔

مولانا فراہیؒ نے رمی جمرات کی عملی ترتیب، تینوں ستونوں کے حجم، پھر پہلے اور دوسرے دن رمی کے بعد خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے دعا کرنے اور تیسرے دن کی رمی کے بعد کسی دعا کا اہتمام نہ کرنے جیسے امور سے بھی اپنے دعوی پر استدلال کیا ہے۔ مولانا کی ان عبارتوں کو نقل کرنے کے بعد فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "یہ تینوں دلیلیں محض عقلی اور خیالی ہیں۔ ان کی بنیاد پر کسی چیز کا اثبات نہیں ہو سکتا"۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ مولانا نے پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ ہم اس مسئلہ میں محض استنباط کا طریقہ اختیار کریں گے کیونکہ اس سلسلہ میں کوئی صحیح نقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"صحیح روایات میں سنت رمی جمرہ کی اصل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر اس کے متعلق کوئی صحیح روایت ثابت ہوتی تو اس سے بڑھ کر کیا بات ہو سکتی تھی لیکن جہاں تک معلوم ہے، اس کے متعلق کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وجہ سے ہم نے استنباط کی راہ اختیار کی ہے"[1]

مولانا فراہیؒ کا یہ طریقہ اسلاف کے طریقے کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ائمہ فقہ بعض مسائل بیان کر دیتے ہیں لیکن جب اس کی کوئی دلیل نہیں پاتے تو کہتے ہیں کہ یہ امر تعبدی ہے یا پھر عقل و استنباط کے ذریعہ اس کو ثابت کرتے ہیں۔[2] اس لئے اگر مولانا فراہیؒ نے ایک نہایت عقلی ہوئی اور

---

[1] مولانا فراہیؒ: "تفسیر سورۂ فیل" ص ۵۵ [2] اس طرح کی مثالیں علامہ ابن رشد کی "بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد" میں بہت ملیں گی اور بسا اوقات علامہ [illegible] بھی معلوم ہوتے ہیں۔

قرین قیاس بات کہی ہے تو اس کے انکار کے لئے بھی اسی درجہ کی لگتی ہوئی بات پیش کرنی چاہئے اسے محض عقلی اور خیالی کہہ کر رد کر دینا کافی نہیں ہے۔

اس سلسلہ کا ایک اعتراض لفظ "جمرہ" کے معنی سے متعلق ہے۔ مولانا نے اس کے متعلق بہت سے معانی اور اس سلسلہ کے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

"ان اقوال میں اگرچہ تھوڑا بہت اختلاف ہے لیکن اتنا واضح ہے کہ "جمرہ" اس جمعیت کو کہتے ہیں جس کو اپنی شوکت و قوت پر اس درجہ اعتماد ہو کہ کسی دوسری جماعت سے وابستہ ہونے کی ضرورت محسوس نہ کرے تم خود کہہ سکتے ہو کہ اس کا بہترین مصداق ابرہہ کی فوج ہو سکتی ہے جو تمام قبائل سے بے نیاز ہو کر اپنی طاقت کے بھروسہ عرب پر ٹوٹ پڑی تھی اور چونکہ منیٰ کے ستون اسی کی یادگار تھے۔ اس وجہ سے ان کو جمرات کہتے ہیں۔" سلہ

مولانا کے مذکورہ خیال و تحقیق پر نقد کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"ان اقوال میں سے صرف اسی قول کو اختیار کرنا اور صحیح بتلانا جس سے اپنے اختیار کردہ قول کی تائید ہوتی ہو یا اسے کھینچ تان کر اپنے مطلوبہ مفہوم میں لیا جا سکتا ہو، صحیح نہیں۔"

عرض ہے کہ جب ایک لفظ کے مختلف معانی و مفاہیم بیان کئے جاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ موقع کی مناسبت سے کسی ایک کو ہی اختیار کیا جائے گا اور مولانا نے یہی کیا ہے کہ موقع و محل کے اعتبار سے جو بات زیادہ موزوں اور قرین قیاس تھی اسے راجح قرار دیا۔ خدا معلوم اس میں کونسی کھینچ تان کی ہے اور زبردستی مفہوم تراشی۔ اگر ایسا ہی کرنا ہوتا تو وہ دوسرے اقوال و معانی بیان ہی کیوں کرتے۔ یہ تو صرف اعتراض برائے اعتراض ہے۔ سلہ

سلہ مولانا فراہیؒ "تفسیر سورۂ فیل" صہ ۹۶

سلہ مولانا فراہیؒ نے اقوال کی روشنی میں یہ مفہوم اخذ کیا ہے۔ ان میں "لسان العرب" کا ایک قول یہ بھی ہے کہ وجمرہ کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی ایک قبیلہ اپنے تمام حریف قبائل کے مقابلہ میں اقدام کیلئے مجتمع ہو، یہیں سے منیٰ کے ان مقامات کو جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں جمرات کہے گئے، اس طرح کے اور بھی متعدد اقوال مولانا نے "لسان العرب" سے نقل کئے ہیں، تو کیا یہاں بھی کہا جائے گا کہ ان اصحاب لغت نے کھینچ تان کی ہے؟

مولانا نے لکھا ہے کہ:

"اہل عرب ابو رغال کی قبر کو جس نے ابرہہ کو راستہ بتایا تھا، سنگسار کرتے رہے۔ یہ اصحاب فیل پر رجم کی نظیر ہے۔ اسلام میں ابو رغال کی قبر پر سنگساری بند کر دی گئی کیونکہ اولاً کسی مخصوص قبر کو سنگسار کرنا اسلام کی رفعت اور بلندی کے منافی ہے۔ ثانیاً رمی جمرات، واقعۂ فیل کی یادگار باقی رکھنے کے لئے کافی تھی، تو پھر ابو رغال کی قبر کو سنگسار کرنے کی رسم کو باقی رکھنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔" سلہ

اس پر نقد کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "یہ سلسلہ اسلام کے بعد بھی جاری رہا" پھر اپنے اس دعویٰ پر دلیل فراہم کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اہل عرب ہر زمانہ میں نفرت و لعنت کے اظہار کے طور پر ابو رغال کی قبر کو سنگسار کرتے رہے ہیں۔ اسے اصحاب الفیل پر رجم کی نظیر بتانا اور کہنا کہ "رمی جمرات واقعۂ فیل کی یادگار کے لئے کافی تھے اس لئے اسلام میں ابو رغال کی قبر پر سنگساری بند کر دی گئی" صحیح نہیں ہے۔"

ہماری گزارش یہ ہے کہ یہاں مقالہ نگار کو غلط فہمی ہو گئی ہے، کیونکہ ابو رغال کی قبر پر سنگساری کو نظیر کہنے کا مطلب مولانا کے نزدیک غالباً یہ ہے کہ واقعۂ فیل کے بعد ان مقامات میں جہاں اہل عرب سنگ باری کیا کرتے تھے مزید دو جگہوں کا اضافہ ہو گیا یعنی ابو رغال کی قبر اور جمرات ثلاثہ۔ اس طرح دونوں واقعۂ فیل کی یادگار ہونے میں باہم نظیر تھے۔ لیکن مخصوص قبر کو سنگسار کرنا اسلام کی رفعت و بلندی کے منافی ہے اس لئے اس کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ رہی یہ بات کہ اسلام کے بعد بھی بہت دنوں تک اس کی قبر سنگسار کی جاتی رہی۔ تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے اس کی اجازت دے رکھی ہے؟ یہ تو محض اپنے جذبہ کی تسکین کے لئے آدمی کر گزرتا ہے جس طرح اور بہت سے ممنوع کام کر گزرتا ہے۔

مولانا نے اپنی بحث کے اختتام پر "رمی جمار" کی اپنی بیان کردہ حقیقت کے تناظر میں اس کے اثرات و نتائج کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ کنکریاں مارتے وقت جس شخص کا تصور یہ ہوگا کہ

سلہ مولانا فراہیؒ "تفسیر سورۂ فیل" صہ ۹۶ – ۹۷

وہ شیطان کو کنکریاں مار رہا ہے، وہ اپنے دل میں کوئی خاص احساس اور جوش و جذبہ نہیں پائیگا، جبکہ واقعۂ فیل کی یادگار (یعنی ابرہہ کے لشکر کی پسپائی اور خدا کی غیر معمولی نصرت) کا تصور اگر ذہن میں ہوگا تو اسکے احساسات و تاثرات کی کیفیت بالکل مختلف ہوگی اور اسکے دل میں ایسا جوش و جذبہ ہوگا جسکا آسانی سے اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔" [1]

مولانا کے مذکورہ بیان پر مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ:

"یہ اثرات و نتائج بھی سراسر ذہن کی اختراع ہیں، جو ایک واقعہ کو پہلے سے مان کر نکالے گئے ہیں، علامہ فراہی کو شیطان کے رجم کرنے کی سنت میں کوئی تاثیری نظر نہیں آتی حالانکہ اسلام کے اسرار و حکم جاننے والے بہت سے علماء نے اسی میں عظیم اثرات بیان کئے ہیں:"

لیکن بعد امام غزالی اور شاہ ولی اللہ رحمہما اللہ کی عبارت نقل کر کے ان اثرات و نتائج کو بیان کیا ہے جو شیطان کو رجم کرنے کے تصور سے ذہن میں مرتب ہوتے ہیں حالانکہ یہاں بھی وہی بات کہی جا سکتی ہے جو انھوں نے مولانا کے خیال پر نقد کرتے ہوئے لکھی ہے کہ "یہ اثرات و نتائج بھی سراسر ذہن کی اختراع ہیں جو ایک واقعہ کو پہلے سے مان کر نکالے گئے ہیں"۔

شاہ صاحبؒ اور امام غزالیؒ نے جن اثرات و نتائج کو بیان کیا ہے قرآن و حدیث سے انکی طرف کوئی خاص اشارہ بھی نہیں ملتا جبکہ مولانا کے بیان کردہ اثرات و نتائج کی طرف بعض روایتوں سے، حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے بھی اشارہ ملتا ہے جسے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اور دوبارہ پھر نقل کر دیتے ہیں:

عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انما جعل الطواف بالبيت والسعي بين الصفا والمروة ورمي الجمار لاقامة ذكر الله لا لغيره [2]

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طواف بیت اللہ، سعی بین الصفا والمروۃ اور رمی جمار محض یاد الٰہی کو قائم کیلئے بنائے گئے ہیں ان کا اور کوئی مقصد نہیں۔

ظاہر ہے خدا کی یاد کا یہ مولانا کی بیان کردہ تاویل کی روسے (جبکہ ابرہہ کی شکست کا پورا پس منظر ذہن میں ہو) جس خاص جوش و جذبہ کیساتھ ہو سکتا ہے، شیطان کو سنگسار کرنے کے تصور سے وہ جوش و جذبہ کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟ پھر مولانا نے جن اثرات و نتائج کو بیان کیا ہے وہ انتہائی گہرے ہونے کے باوجود اتنے سادہ اور عام فہم ہیں کہ ہر کس و ناکس کے ذہن پر آسانی مرتسم ہو سکتے ہیں جبکہ شاہ صاحبؒ اور امام غزالیؒ کے بیان کردہ تصورات و اثرات جلدی عام آدمی کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتے۔

مقالہ خاصہ کے حج کی تاریخ کے بعد صاحب مقالہ نے ایک دوسرے مضمون میں مولانا فراہیؒ کی "تفسیر سورۂ فیل" پر بھی نقد و اعتراض کیا ہے، ہم اسکا بھی جائزہ لے رہے ہیں، انشاء اللہ جلد ہی اسکو بھی ہدیۂ ناظرین کیا جائیگا۔۔۔

---

[1] ایضاً ص ۹۸، ۹۹ ۔ [2] امام جلال الدین السیوطی۔ الدر المنثور ۱/ ۱۶۱

بحث و نظر

ٹخنوں سے نیچے کپڑا پہننا

مفتی عبدالرؤف صاحب

سوال:- لنگی یا پاجامہ وغیرہ ٹخنوں سے نیچے لٹکا کر پہننے کا کیا حکم ہے اور کیوں؟ کیا یہ ناجائز ہے؟

جواب:- ہاں! لنگی یا پاجامہ یا کوئی اور کپڑا جس سے تن پوشی کا کام لیا جاتا ہے، ٹخنوں سے نیچے لٹکا کر پہننا ناجائز ہے اور کبیرہ گناہ ہے۔ لنگی وغیرہ کو ٹخنوں سے نیچے لٹکا کر پہننے کو عربی زبان میں اسبال ثوب کہتے ہیں۔ احادیث میں اسبال ثوب پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ اسکی عدم جواز کی وجہ ہے۔ اختیال یا خیلاء (تکبر و خود پسندی) فخر (ذاتی یا اسلاف کی خوبیوں پر دعوی تشرف و برتری کرنا) بطر (اترا کر چلنا اور ناحق کسی کو اپنے سے ہیٹا سمجھنا) جو لوگ اپنے کپڑوں کو ٹخنوں سے نیچے لٹکا کر پہنتے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر لوگ علی العموم اختیال و فخر اور عجب و بطر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ اللہ تعالی کو بندوں کا اختیال و فخر سخت ناپسند ہے۔ چنانچہ حضرت لقمان حکیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو چند نصائح اپنے لڑکے کو تلقین و تعلیم فرمائے ہیں ان میں سے ایک کا ذکر اللہ تعالی نے قرآن مجید میں سورہ لقمان کی اٹھارہویں آیت میں فرمایا ہے جس میں تکبر کی وجہ سے لوگوں سے روگردانی اور زمین پر اترا کر چلنے سے منع فرمایا گیا ہے ولا تصعر خدک للناس ولا تمش فی الارض مرحا ان اللہ لا یحب کل مختال فخور۔ (یعنی لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر اور زمین پر اترا کر مت چل، بے شک اللہ تعالی کسی تکبر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے۔) (ترجمہ مولانا تھانویؒ)

اس آیت میں مغرورانہ شان و انداز سے روکا گیا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث میں بھی متکبرین و خود پسند لوگوں کے بارے میں سخت وعیدیں آئی ہیں، چنانچہ مشکوٰۃ المصابیح باب الغضب والکبر میں ص ۴۲۳ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللہ تعالی الکبریاء

ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی واحدا منهما ادخلته النار. وفی روایة قذفته فی النار (رواہ مسلم) " یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت یہ ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میرا ازار تو جو شخص ان میں سے کسی میں میرا مقابلہ کرے گا تو میں اس کو آگ میں داخل کروں گا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس کو آگ میں پھینک دوں گا۔"

آگے ایک دوسری حدیث بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی روایت کرتے ہیں:

عن ابی ھریرة ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال لا ینظر اللہ یوم القیامة الی من جر ازارہ بطراً۔ (متفق علیه) مشکوٰۃ ص ۳۷۳ " یعنی ابوہریرہ رضی تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کی طرف نظر نہیں فرمائیں گے جو اپنے تہبند یا جامہ وغیرہ کو ناز سے گھسیٹتا ہوا چلتا ہو۔"

اب سوچیے کہ اللہ تعالیٰ اگر قیامت کے دن کسی کی طرف رحمت وکرم کی نظر سے نہ دیکھیں تو اس کا کیا انجام ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی عنہما سے بھی اسی مفہوم کی ایک حدیث مروی ہے:

عن ابن عمرؓ ان النبی صلی اللہ علیه وسلم قال من جر ثوبه خیلاء لم ینظر اللہ الیه یوم القیامة۔ (متفق علیه) مشکوٰۃ ص ۳۷۳ " یعنی عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے کپڑے غرور سے کھینچتا ہوا چلے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائیں گے۔"

انہی عبداللہ بن عمرؓ سے ایک حدیث اور مروی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ خیلاء وخود پسندی کی وجہ سے ایک شخص اپنا ازار زمین پر گھسیٹتا ہوا چلتا تھا۔ اس کو زمین میں (زندہ) دھنسا دیا گیا جو قیامت تک زمین میں گڑتا ہی چلا جائے گا۔ وہ حدیث یہ ہے:

عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بینما رجل یجر ازارہ من الخیلاء خسف به فھو یتجلجل فی الارض الی یوم القیامة۔ (رواہ البخاری) مشکوٰۃ ص ۳۷۳

امام حافظ علامہ شمس الدین ذہبی علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور تالیف کتاب الکبائر میں لکھا ہے کہ

جر ثوب (یعنی کپڑا نیچا پہن کر اس کو گھسیٹتے ہوئے چلنا) یا اسبال ثوب (یعنی ٹخنوں سے نیچے پہننا) یہ دونوں صورتیں گناہ کبیرہ میں داخل ہیں چنانچہ اس بارے میں انھوں نے جو عنوان لکھا ہے اسی میں اسبال کے کبیرہ ہونے کی صراحت ہے اور جب اسبال کا یہ حکم ہے تو جر ثوب کا تو بدرجہ اولیٰ یہی حکم ہوگا۔ لکھتے ہیں الکبیرة الخامسة والخمسون اسبال الازار والثوب واللباس والسراویل تعززا وعجبا وفخرا وخیلاء۔ یعنی پچپنواں کبیرہ گناہ لنگی اور کپڑے اور لباس اور پاجامے کا بطور تفاخر وخود پسندی اور فخر وغرور کے ٹخنوں سے نیچے لٹکا کر پہننا ہے۔

اس سلسلے میں علامہ ذہبی علیہ الرحمہ نے استدلالاً جو احادیث پیش کی ہیں میں بقدر ضرورت ان میں سے چند یہاں نقل کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ اسبال ثوب یعنی کپڑوں کا ٹخنوں سے نیچے لٹکا کر پہننا کس قدر قبیح اور خطرناک کام ہے۔ قال النبی صلی اللہ علیه وسلم ما اسفل من الکعبین من الازار فھو فی النار۔ رواہ البخاریؒ من حدیث ابی ھریرة۔ (الترغیب) یعنی نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ازار کا وہ حصہ جو دونوں ٹخنوں سے نیچے ہو وہ آگ میں ہوگا (یا پہننے والے کو آگ میں لے جائے گا) یعنی بہت برا کام ہے۔

اس کو امام بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

وقال علیه الصلوٰة والسلام " ثلاثة لا یکلمھم اللہ یوم القیامة ولا ینظر الیھم ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم المسبل والمنان والمنفق سلعته بالحلف الکاذب۔ رواہ مالکؒ والبخاریؒ ومسلمؒ والترمذی والنسائیؒ وابن ماجه من حدیث ابن عمر بلفظ لا ینظر اللہ یوم القیامة الی من جر ثوبه خیلاء۔

یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین قسم کے لوگ ہوں گے کہ قیامت کے روز اللہ تعالےٰ ان سے کلام نہیں فرمائیں گے اور نہ ان کی طرف دیکھیں گے (بنظر رحمت) اور نہ ان کو پاک کریں گے (گناہوں کی گندگی سے) اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ان میں ایک شخص مسبل ہوگا (ٹخنوں سے نیچے تک خود پسندی وغرور سے اپنا کوئی کپڑا لٹکا کر پہننے والا) دوسرا شخص منان ہوگا (کسی پر احسان کرکے اپنی برتری کے لئے احسان جتانے والا) اور تیسرا شخص وہ ہوگا جو جھوٹی قسم کھا کر اپنا سودا بیچے اور اس کی نکاسی کرے۔

وقال عليه الصلوة والسلام ازرة المؤمن الى نصف ساقيه ولا حرج عليه فيما بينه وبين الكعبين ما كان اسفل من الكعبين فهو في النار۔ رواه النسائی من حديث ابی هريرة وشاهده من حديث انسؓ۔ عند احمدؒ رواته رواة الصحيح (الترغيب) وهذا عام في السراويل والثوب والجبة والقباء والفرجية وغيره من اللباس فنسأل الله العافية۔ یعنی مومن کا جاذ ستر پوشی تہبند و پاجامہ وغیرہ اس کی نصف پنڈلیوں تک رہتا ہے اور اگر نصف ساق کے نیچے ٹخنوں تک رہے تو کوئی حرج نہیں ہے اور جو ٹخنوں سے نیچے ہو تو وہ جہنم میں ہوگا یعنی گناہ کا کام ہے۔ اس حدیث کو امام نسائیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث سے لے کر روایت کیا ہے اور حضرت انسؓ کی حدیث بھی اس پر شاہد ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس حدیث کی روایت کرنے والے صحیح حدیث کی روایت کرنے والے ثقات ہیں۔

عن ابی هريرةؓ قال بينما رجل يصلي مسبلا ازاره قال له رسول الله اذهب فتوضأ ثم جاء فقال اذهب فتوضأ فقال له رجل يا رسول الله ما لك امرته ان يتوضأ ثم سكت عنه فقال انه كان يصلي وهو مسبل ازاره ولا يقبل الله صلاة مسبل ازاره۔ یعنی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس وقت جب کہ ایک آدمی اپنا ازار ٹخنے سے نیچے لٹکا کر نماز پڑھ رہا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا جاؤ وضو کرو۔ اس کے بعد وہ وضو کر کے آیا تو آپ نے پھر فرمایا جاؤ وضو کرو یہ علم دیکھ کر کسی آدمی نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! (صلے اللہ علیہ وسلم) کیا بات آپ نے خصوصی فرمائی کہ اس کو وضو کرنے کا حکم دیا۔ اس کی بات سن کر آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کچھ سکوت فرمایا۔ اس کے بعد یہ فرمایا کہ وہ اپنا ازار ٹخنوں سے نیچے لٹکا کر نماز پڑھ رہا تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی کی نماز قبول نہیں فرماتے ہیں جبکہ وہ اپنا ازار (لنگی یا پاجامہ وغیرہ) ٹخنوں سے نیچے لٹکائے ہوئے ہو۔ ازار لغت میں اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنی تن پوشی کرتا ہے۔

ولما قال صلی الله علیه وسلم من جر ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة۔ فقال ابو بكرؓ رضي الله عنه يا رسول الله ان ازاري يسترخي

الا ان اتعاهده فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم انك لست ممن يفعله خيلاء۔ یعنی جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اپنا کپڑا (لنگی، پاجامہ) از راہ تکبر سے زمین پر گھسیٹے گا یعنی ٹخنوں سے نیچے پہن کر چلے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نہیں دیکھیں گے (ناراضی اور غصے کی وجہ سے) یہ سن کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! (صلے اللہ علیہ وسلم) میرا ازار ڈھیلا ہو کر نیچے سرک جاتا ہے مگر یہ بات ہے کہ میں اس کو سنبھالتا اور درست کرتا رہتا ہوں۔ (تو کیا میں بھی اللہ کی نظر رحمت و کرم سے محروم رہوں گا) تو اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو خیلاء و تکبر سے ایسا کرتے ہیں (کیونکہ ازار کا ڈھیلا ہو کر بلا قصد و ارادہ سرک کر ٹخنوں سے نیچے چلا جانا اقبال و اختیار کی وجہ سے نہیں ہے ایسی صورت میں ازار کو سنبھالتے رہنا عدم خیلاء کی صریح دلیل ہے)۔ لہٰذا جو شخص دیدہ و دانستہ ایسا کرے گا اس کے لئے یہ وعید ہے۔ اگر کسی کا ازار بے خیالی میں یا توند کی وجہ سے بلا ارادہ سرک کر نیچا ہو جائے اور وہ اس کو سنبھال لیا کرے تو اس کے لئے یہ وعید نہیں ہے۔

بعض لوگ جو لنگی، پاجامہ ٹخنوں سے نیچے پہننے کے عادی ہوتے اور ان کو اس پر اصرار ہوتا ہے جب ان سے اس کے عدم جواز کے بارے میں کچھ کہا جاتا ہے تو یہ کہہ کر بات ٹال دیتے ہیں اور اپنی روش پر بدستور قائم رہتے ہیں کہ ہم جو ازار (لنگی، پاجامہ) ٹخنوں سے نیچے پہنتا ہوں اس کو خیلاء و خود پسندی کی وجہ سے نہیں پہنتا۔ اس لئے میرے لئے یہ ناجائز کیسے ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ان کی یہ بات کہ ان کا یہ اسبال ثوب، خیلاء و عجز، عجب و فخر کی وجہ سے نہیں ہے، تسلیم نہیں کیا جا سکتا ورنہ وہ اس پر اصرار نہیں کرتے بلکہ اس سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرتے جیسا کہ اوپر والی روایت میں اس سے بچنے کی کوشش کی صراحت موجود ہے اور اگر بالفرض ان کی یہ بات تسلیم کر ہی لی جائے تب بھی یہ اسبال ثوب جائز نہیں ہو سکتا۔ حدیث میں ارشاد ہے:

من تشبه بقوم فهو منهم یعنی جو جن لوگوں کی مشابہت اختیار کرے وہ انہیں میں سے ہے۔

پس جو شخص بالقصد جر ثوب یا اسبال ثوب کرے گا وہ گناہ کا مرتکب ہوگا کیونکہ عجب و خیلاء ناجائز ہے تو جیسے برے لوگوں سے مشابہت اختیار کرنا جائز نہیں ہوتا اسی طرح عجب و خیلاء

والوں سے بھی مشابہت جائز نہیں ہو سکتی۔ پس جو کوئی بالقصد ان سے تشبہ اختیار کرے گا تو وہ بھی انھیں میں سے ہوگا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تشبہ سے بار بار منع فرمایا ہے۔ اسلام کے اندر کفار، فساق، اغیار کے ساتھ تشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ تشبہ بالاغیار سے روکنے کے لیے بہت سے واقعات اور روایتیں احادیث کے اندر موجود ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر ایک واقعہ قلمبند کرتا ہوں جو دیکھنے میں بظاہر بہت معمولی سی بات معلوم ہو رہی ہے لیکن حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بہت صاف طریقے سے منع فرمایا ہے وہ یہ ہے:

"تم کفار مکہ کی مخالفت کرو وہ اپنا عمامہ (دستار) ننگے سر پر باندھتے ہیں تو تم ٹوپیوں کے اوپر اپنی دستاریں باندھا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلمان کے لئے ٹوپی پہنے بغیر پگڑی باندھنا جائز نہیں ہے۔ کوئی ٹوپی کے اوپر پگڑی باندھے یا بغیر ٹوپی کے باندھے بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا لیکن اس سے بھی یہ تعلیم مل رہی ہے کہ ہماری مشابہت کفار و اغیار، مبتدعین و فساق اور اہل کتاب وغیرہم سے بھی کسی چیز میں نہیں ہونی چاہئے چاہے وہ کتنی ہی معمولی بات معلوم ہو۔

مشکوۃ المصابیح باب الترجل صفحہ ۳۸۲ میں ایک روایت ہے:

عن ابن حنظلية رجل من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم قال قال النبي صلى الله عليه وسلم نعم الرجل خريم الاسدي لولا طول جمته واسبال ازاره، فبلغ ذلك خريما فاخذ شفرة فقطع بها جمته الى اذنيه ورفع ازاره الى انصاف ساقيه۔ رواه ابوداؤد

ابن حنظلیہ سے مروی ہے کہ اصحاب نبی صلے اللہ علیہ وسلم میں سے ایک آدمی نے کہا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خریم اسدی اچھے آدمی ہوتے اگر ان کے جمّہ کی لمبائی اور ازار کا اسبال نہ ہوتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمودہ حضرت خریم رضؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے چاقو لے کر اپنے سر کا جمّہ کاٹ کر اپنے کانوں کے برابر کر دیا۔ اور اپنا تہبند آدھی پنڈلیوں تک کر لیا۔

تشریح: جمّہ سر کے ایسے بالوں کو کہتے ہیں جن کی لمبائی محل جمّہ یعنی کندھے تک ہو اور جو بال کانوں کی لو تک ہوں ان کو وفرہ کہتے ہیں اور وہ بال جو جمّہ اور وفرہ کے درمیان تک ہے اس کو لمّہ کہتے ہیں۔

اس روایت میں حضرت خریم اسدی رضی اللہ عنہ کی اچھائی کو موقوف کیا گیا سر کے بال کی مذکورہ لمبائی اور اسبال ازار کے نہ ہونے پر۔ اور خریم اسدیؓ کو جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ بری بات ہے تو انھوں نے فوراً اس منافی خیر کو اپنے سے دور کر کے اچھے ہونے کی کوشش کی۔ خریم اسدی رضی اللہ عنہ کوئی مغرور و خیلاء پسند آدمی نہیں تھے مگر ان کی وضع قطع میں لاعلمی کی وجہ سے خیلاء کرنے والوں کے ساتھ مشابہت تھی۔ کیونکہ ان کے اچھے ہونے کو خیلاء کرنے والوں کے ساتھ ترک مشابہت کو مشروط قرار دیا گیا۔ اور خریم اسدی رضی اللہ عنہ نے سنتے ہی آپ کا ارشاد سنکر بلا تاخیر اپنی اصلاح کرلی اور طیب نیت و حسن تعمیل امر سے کام لیا۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

لہٰذا کسی شخص کو بھی کوئی لباس، لنگی، پاجامہ، کرتا، قمیص، جبّہ، عبا، قبا، شیروانی، چیسٹر، پینٹ وغیرہ بطور غرور و خود پسندی اور خیلاء و فخر اور تکبر و بطر کے ٹخنوں سے نیچے پہننا یا قصداً متکبرین سے مشابہت اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ••

غزل

صفدرؔ نیوتنوی

خوشنما قباؤں سے شہرتیں نہیں ملتیں
کاغذی گلابوں میں نکہتیں نہیں ملتیں

زندگی کا آئینہ جھانک کر ذرا دیکھو
صورتیں تو ملتی ہیں سیرتیں نہیں ملتیں

وقت کی روانی کے ساتھ بہہ رہے ہیں سب
رخ کو موڑنے والی ہمتیں نہیں ملتیں

فقر کی بلندی کو زر پرست کیا جانیں
دولتوں کے ڈھیروں میں عظمتیں نہیں ملتیں

آرزو کے غنچے تو کوششوں سے کھلتے ہیں
منت و سماجت سے راحتیں نہیں ملتیں

فکر کے مناروں نے چاند چھو لیا لیکن
قلب کو ذرا دیکھو وسعتیں نہیں ملتیں

کل پہ بات مت ٹالو کل کا کیا بھروسا ہے
اس جہانِ فانی میں مدتیں نہیں ملتیں

اے صفدرؔ یہ کیا کم ہے دوست مل گئے تم کو
ورنہ اس زمانے میں چاہتیں نہیں ملتیں۔

حضرت ابو عبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمن رافت پاشا ——— ترجمانی: ابو جاوید

وہ پاکیزہ رو، خوش شکل، لاغر اندام اور سبک رخسار شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں دیکھ کر آنکھوں کو راحت ملتی اور ان سے مل کر روح کو سکون اور دل کو قرار میسر آتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ بے حد خوش اخلاق، منکسر المزاج اور شرم و حیا کے پیکر تھے لیکن جب کوئی سخت معاملہ پیش آتا یا کوئی مشکل گھڑی سامنے آتی تو وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی مانند نظر آتے۔ وہ رونق و صفائی اور تیزی اور کاٹ میں تلوار کی دھار کے مشابہ تھے۔ یہ امت محمدؐ کے امین حضرت ابو عبیدہ عامر بن عبداللہ بن جراح فہری قرشی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"قریش کے تین آدمی سب سے زیادہ درخشندہ رو، سب سے زیادہ خوش اخلاق اور سب سے زیادہ باحیا ہیں۔ اگر وہ تم سے بات کریں گے تو کبھی جھوٹ نہیں بولیں گے اور اگر تم ان سے بات کرو گے تو کبھی تمہاری تکذیب نہیں کریں گے۔ وہ ہیں ابو بکر صدیقؓ، عثمان بن عفانؓ اور ابو عبیدہ ابن جراح رضوان اللہ علیہم۔"

حضرت ابو عبیدہؓ السابقون الاولون میں سے تھے۔ وہ حضرت ابو بکرؓ کے مسلمان ہونے کے دوسرے دن انہی کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت ابو بکرؓ ان کو، حضرت عبدالرحمن بن عوف کو، حضرت عثمان بن مظعون کو، اور حضرت ارقم بن ابی ارقم کو لے کر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان لوگوں نے آپ کے روبرو کلمہ حق کا اعلان کیا۔ یہ لوگ بنیاد کی وہ خشت اولین تھے جس پر اسلام کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی۔

اگرچہ حضرت ابو عبیدہ نے مکہ میں رہتے ہوئے شروع سے آخر تک ان شدید ترین آزمائشوں کو برداشت کرتے ہوئے زندگی گزاری جن میں مسلمانوں کو مبتلا کیا گیا۔ انھوں نے ابتدائی مسلمانوں کے ساتھ مصائب و آلام کی جو سختیاں جھیلیں وہ روئے زمین پر کسی دین کے متبعین نے نہ جھیلی ہوں گی۔ انھوں نے بڑی پامردی اور عزم و حوصلہ کے ساتھ ان ابتلاؤں کا مقابلہ کیا اور ہر موقع پر خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ سچی محبت کا ثبوت دیا لیکن غزوۂ بدر کے موقع پر وہ جس آزمائش میں مبتلا ہوئے

اس کی سختی ہر خیال و قیاس سے بالاتر تھی۔

وہ جنگ بدر میں صفوں کے درمیان اس طرح بڑھ بڑھ کر اور پینترے بدل بدل کر حملہ کر رہے تھے جیسے ان کو نہ تو موت کا کوئی ڈر ہے نہ ہلاکت کا کوئی اندیشہ۔ ان کے حملوں نے مشرکین پر ان کی ہیبت طاری کر دی اور قریش کے بڑے بڑے سورما ان کا سامنا کرنے سے کترانے لگے لیکن ان میں سے ایک شخص ایسا تھا جو ہر وقت ان کا سامنا کرنے کی کوشش کرتا اور ہر موقع پر ان کے بالمقابل آجاتا مگر وہ اس کے راستے سے ہٹ جاتے اور اس کے ساتھ مقابلہ کرنے سے پرہیز کرتے۔ وہ شخص بار بار ان کے اوپر حملہ آور ہوتا اور وہ ہر بار کترا کر دوسری طرف نکل جاتے۔ آخر کار اس نے ان کے لیے سارے راستے مسدود کر دیئے۔ ان کے سامنے آکھڑا ہوا اور ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ جب اس کی یہ حرکتیں حضرت ابو عبیدہؓ کی قوت برداشت سے باہر ہو گئیں تو انھوں نے اس کے سر پر تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ اس کی کھوپڑی کے دو ٹکڑے ہو گئے اور وہ بے جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔

قارئین کرام یہ اندازہ لگانے کی کوشش نہ کریں کہ یہ مرنے والا شخص کون ہو گا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت ابو عبیدہؓ کا امتحان ہر قسم کے خیال و گمان سے بلند تھا۔ اور آپ کا سر چکرا جائے گا جب یہ بات آپ کے علم میں آئے گی کہ حضرت ابو عبیدہؓ کے ہاتھ سے مارا جانے والا شخص کوئی اور نہیں خود ان کے والد عبداللہ بن جراح تھے۔ انھوں نے اپنے والد کو نہیں، ان کی شخصیت میں پائے جانے والے کفر کو قتل کیا تھا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو عبیدہؓ اور ان کے والد کے متعلق قرآن نازل کرتے ہوئے فرمایا:

لا تجد قوما یؤمنون باللہ و الیوم الآخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا آباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم اولئك کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ ویدخلھم

تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور رسولؐ کی مخالفت کی ہے خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے

جنّٰتٍ تجری من تحتها الانہار خالدین فیہا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ اولئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ہم المفلحون۔ (مجادلہ: ۲۲)

ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان لوگوں کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔

حضرت ابوعبیدہؓ کی طرف سے اس بات کا صادر ہونا کچھ حیرت انگیز اور تعجب خیز نہ تھا۔ وہ اپنی قوتِ ایمانی، دینی نصح و خیر خواہی اور امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے لئے امانت داری کے اس مقام بلند پر فائز تھے کہ بہت سے لوگوں کی رشک آمیز نگاہیں ان کی طرف اٹھی رہتی تھیں۔

محمد بن جعفر نے بیان کیا ہے کہ ایک بار نصاریٰ کا ایک وفد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے درخواست کی کہ "ابوالقاسم! آپ ہمارے ساتھ اپنے صحابہ میں سے کسی ایسے شخص کو بھیجئے جس کو آپ ہمارے لئے پسند کرتے ہوں تاکہ وہ ہمارے درمیان ان جائدادوں کا فیصلہ کرے جن کے بارے میں ہمارے اندر اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔" تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم دن کے وقت مجھ سے ملو، میں تمہارے ساتھ ایک قوی امین کو روانہ کروں گا۔"

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں ظہر کی نماز کے لئے بہت سویرے پہنچا۔ اس روز کی طرح میرے دل میں امارت کی کبھی خواہش نہیں پیدا ہوئی تھی اور امارت کی یہ خواہش میرے دل میں صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ ممکن ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ وصف کا میں ہی مصداق ٹھہروں۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگے تو میں اچک اچک کر خود کو نمایاں کرنے لگا، تاکہ آپ کی نظر میرے اوپر پڑ سکے لیکن آپ میری طرف متوجہ ہونے کے بجائے اپنی نگاہوں کو مجمع کے درمیان گردش دیتے رہے یہاں تک کہ آپ کی متجسس نظریں ابوعبیدہ بن جراح پر جا کر ٹھہر گئیں۔ آپ نے ان کو اپنے پاس بلایا اور اہل وفد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"ان کے ساتھ جاؤ اور ان کے درمیان پیدا شدہ نزاعی معاملے کا برحق اور مبنی بر انصاف فیصلہ کر دو۔" یہ دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا "ابوعبیدہ اس فضیلت کو لے اڑے۔"

حضرت ابوعبیدہؓ صرف صفتِ امانت ہی سے متصف نہ تھے وہ امانت داری کے ساتھ ساتھ زبردست

قوتِ ایمانی کے مالک بھی تھے اور بہت سے مواقع پر ان کی اس قوت کا اظہار بھی ہوا تھا۔ اس قوت کا اظہار خاص کر اس وقت ہوا تھا جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کا ایک دستہ قریش کے تجارتی قافلے سے تعرض کرنے کے لئے روانہ فرمایا اور حضرت ابوعبیدہؓ کو اس کا امیر مقرر کیا تھا۔ روانگی کے وقت آپ نے کھجوروں سے بھری ہوئی ایک تھیلی ان کے حوالے کی تھی انھیں زادِ سفر کے طور پر دینے کے لئے اس وقت اس کے علاوہ دوسری کوئی چیز آپ کو میسر نہ تھی۔ حضرت ابوعبیدہؓ اپنے ساتھیوں میں سے ہر ایک کو روزانہ ایک ایک کھجور دیتے اور ہر شخص اس کھجور کو اس طرح چوستا جس طرح شیر خوار بچہ ماں کی چھاتیوں کو چوستا ہے، اور اوپر سے پانی پی لیتا تھا اور یہی اس کی پورے ایک دن کی خوراک ہوتی تھی۔

ان کی قوتِ ایمانی کا اظہار اس وقت بھی ہوا تھا جب غزوہ احد کے موقع پر مسلمانوں کی شکست اور ان کے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کے بعد مشرکین پیہم آوازیں لگا رہے تھے "ہمیں بتاؤ! محمد کہاں ہے؟ بتاؤ ہمیں کہاں ہے محمد؟" تو حضرت ابوعبیدہؓ ان دس افراد میں سے ایک تھے جنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے ان کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا تاکہ آپ کی طرف بڑھنے والے مشرکین کے تیروں کو اپنے سینوں پر روک لیں۔

جنگ ختم ہوئی تو آپ کے سامنے کے دو دانت شہید ہو چکے تھے۔ پیشانی مبارک زخمی ہو گئی تھی اور رخسار مبارک میں خود کی کڑیاں چبھ گئی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو رخسار مبارک سے نکالنا چاہا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے انھیں قسم دے کر کہا کہ یہ کام آپ میرے لئے چھوڑ دیں اور انھوں نے چھوڑ دیا کہ ابوعبیدہؓ یہ خدمت انجام دیں۔

حضرت ابوعبیدہؓ کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ ان کڑیوں کو ہاتھوں سے کھینچ کر نکالتے ہیں تو آپؐ کو تکلیف ہوگی۔ اس لئے انھوں نے ایک کڑی کو دانتوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑا اور زور لگا کر کھینچا تو وہ باہر آگئی مگر ساتھ ہی ان کا ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔ پھر انھوں نے دوسری کڑی کو بھی اپنے دانتوں کی مضبوط گرفت میں لے کر زور لگایا، کڑی پیشانی مبارک سے نکل گئی مگر ان کا دوسرا دانت بھی ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کہا کرتے تھے کہ "ابوعبیدہؓ ان لوگوں میں سب سے اچھے ہیں جن کے آگے کے دانت ٹوٹے ہوئے ہوں۔"

حضرت ابو عبیدہؓ شروع سے آخر تک تمام غزوات میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے اور جب سقیفۂ بنی ساعدہ کا موقع آیا (جس موقع پر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دست مبارک پر خلافت کی بیعت کی گئی تھی) تو حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابو عبیدہؓ سے کہا کہ "اپنا ہاتھ بڑھایئے آپ کی بیعت کروں، اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ سے یہ کہتے سنا ہے کہ ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور ہماری امت کے امین تم ہو"۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ "میں اس شخص سے آگے بڑھنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم مسلمانوں کا امام بنایا اور آپؐ کی وفات تک وہ ہماری امامت کرتا رہا"۔ اور اس کے بعد جب حضرت ابو بکرؓ کے دست مبارک پر خلافت کی بیعت ہو گئی تو حضرت ابو عبیدہؓ حق و صداقت کے معاملہ میں ان کے بہترین خیر خواہ اور خیر و فلاح میں ان کے قابل اعتماد معاون ثابت ہوئے۔

پھر جب حضرت ابو بکرؓ نے اپنے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لئے خلافت کی وصیت کی اور اس کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کیں تو حضرت ابو عبیدہؓ نے مکمل طور پر ان کی اطاعت کی اور ایک مرتبہ کے علاوہ کبھی ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ وہ کون سا موقع تھا جب حضرت ابو عبیدہ نے خلیفۃ المسلمین کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی؟

ہوا یہ کہ جس زمانے میں وہ شام کے علاقے میں لشکر مجاہدین کی قیادت فرما رہے تھے اور یکے بعد دیگرے فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے پورے علاقے کو فتح کرتے ہوئے ایک طرف مشرق میں دریائے فرات اور دوسری جانب شمال میں ایشیائے کوچک تک پہنچ گئے تھے ۔۔۔ شام میں اچانک طاعون کی زبردست اور غیر معمولی وبا پھوٹ پڑی جس نے بے شمار انسانوں کو اپنے بھیانک خونی پنجوں میں جکڑ لیا اور دیکھتے دیکھتے ان گنت انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو وہ سخت تشویش میں مبتلا ہو گئے اور انھوں نے ایک قاصد کو اس پیغام کے ساتھ ابو عبیدہؓ کی خدمت میں روانہ کیا کہ "اچانک مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے جس میں میرے لئے آپ سے مشورہ کرنا ناگزیر ہے۔ میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ اگر میرا خط آپ کے پاس رات کے وقت پہنچے تو صبح کا انتظار کئے بغیر عازم سفر ہو جایئے اور اگر دن کو ملے تو شام ہونے سے پہلے رخت سفر باندھ لیجئے"۔ حضرت ابو عبیدہ کو جب حضرت عمرؓ کا یہ خط ملا تو انھوں نے فرمایا:

"مجھے معلوم ہے کہ امیر المؤمنین کو مجھ سے کیا ضرورت ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کو بچا لینا چاہتے ہیں جو بچنے والا نہیں ہے"۔ پھر انھوں نے ان کے جواب میں لکھا: "امیر المؤمنین! میں سمجھ گیا کہ آپ کو مجھ سے کیا ضرورت ہے۔ میں مسلمانوں کے لشکر میں ہوں اور اپنے دل میں اس قسم کی کوئی خواہش نہیں پاتا کہ میں اپنے آپ کو اس وبا سے محفوظ کر لوں جس میں یہ سب لوگ مبتلا ہیں۔ اس وقت تک ان سے الگ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے بارے میں اپنا فیصلہ نافذ نہیں کر دیتا۔ اس لئے جب میرا یہ خط آپ کو ملے تو آپ مجھے اپنی قسم سے بری کر دیجئے اور مجھے یہاں ٹھہرنے کی اجازت مرحمت فرما دیجئے"۔ حضرت عمرؓ نے یہ خط پڑھا تو رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ حاضرین نے ان کی شدت گریہ کو دیکھ کر پوچھا کہ کیا ابو عبیدہؓ کا انتقال ہو گیا؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ "نہیں ان کا انتقال نہیں ہوا ہے مگر موت ان سے زیادہ دور نہیں ہے"۔ اور حضرت عمرؓ کا یہ اندیشہ غلط نہیں تھا اس لئے کہ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہ طاعون میں مبتلا ہو گئے اور جب ان کی موت کی گھڑی قریب آگئی تو انھوں نے اپنی فوج کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا "میں تم لوگوں کو ایک وصیت کر رہا ہوں، اگر اس پر عمل کرو گے تو ہمیشہ خیر و فلاح پر قائم رہو گے۔ دیکھو! نماز قائم کرو، ماہ رمضان کے روزے رکھو، صدقہ و خیرات کرتے رہو، حج اور عمرہ ادا کرو، آپس میں ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کیا کرو، اپنے امراء کے ساتھ خیر خواہی کرو، ان کے ساتھ خیانت اور فریب سے کام نہ لو، اور دنیا تم کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اس لئے کہ اگر آدمی کو ہزاروں سال کی طویل زندگی بھی مل جائے تب بھی اس کیلئے اس انجام سے دو چار ہونا ضروری ہے جس سے اس وقت میں دو چار ہوں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"

پھر انھوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا "معاذ! میرے بعد لوگوں کو نماز تم پڑھاؤ گے"۔ اور تھوڑی دیر بعد طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔۔ انتقال کے بعد حضرت معاذ بن جبلؓ نے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

لوگو! تم ایک ایسے شخص کی موت کے صدمے سے دو چار ہو کر بخدا میں نے آج تک کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اس سے زیادہ مخلص و پاک طینت اور اس سے زیادہ شر و کینہ سے دور ہو۔ میں نے کسی ایسے شخص کو دیکھا جو اس سے زیادہ آخرت سے محبت کرنے والا اور مسلم عوام کا خیر خواہ ہو۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے رحم کی دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر رحم فرمائے۔ ••

حلقۂ یاراں

برادر محترم ولی اللہ صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ جولائی ۱۹۹۰ء کا شمارہ نظر سے گذرا۔ اخبار علیہ کا سلسلہ اچھا ہے۔ بقیہ مضامین بھی قابل قدر ہیں۔ البتہ ایک شمارہ میں مختلف النوع مضامین ہوں تو بہتر ہے۔ ان کے درمیان یک رخا پن اچھا نہیں لگتا۔ پھر یہ کہ امت کی صحیح رہنمائی بھی ہمارا فریضہ ہے۔ اس سلسلے میں ملک کی موجودہ صورتحال کی روشنی میں کچھ چیزیں ان کی تسکین کیلئے آنا چاہیں خصوصاً جبکہ موجودہ قیادت حالات سے کافی پریشان ہے۔

ایک گذارش یہ بھی ہے کہ جامعہ کے "لیل ونہار" کے ذیلی عناوین اس طرح متعین کئے جائیں کہ اس کا جو مقصد ہے یعنی لیل ونہار سے ربط مجھ تک آئے۔ رسائل کے علاوہ" جناب عبدالعزیز خاں صاحب کا انتقال" کے عنوان کو اگر یوں دیا جاتا "جناب عبدالعزیز خاں صاحب کے انتقال پر جامعہ کی تعزیت" تو بہتر تھا۔ اخیر میں دعا ہے کہ اللہ آپ کی کوششوں کو قبول فرمائے اور "حیات نو" ترقی کرتا جائے۔

والسلام۔ طالب خیر: عبدالبر اثری،

برادر ولی اللہ صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہ جولائی کا شمارہ نظر کے سامنے ہے۔ نسیم ظہیر اصلاحی غازی صاحب اور عبید اللہ فہد فلاحی کے مضمون کا بغور مطالعہ کیا۔ برادر "حیات نو" جس کے خریداروں کی اکثریت کم پڑھے لکھے لوگوں کی ہے لیکن افسوس جبکہ کم پڑھے لکھے لوگوں کیلئے اس میں کوئی مضمون نہیں ہے۔ حیات نو کا دامن عوام الناس کے لئے دن بدن تنگ ہوتا جارہا ہے اور تحقیقی ریسرچ اسکالر کا ہوکر رہ گیا ہے اور ایسی صورت حال میں حیات نو کی توسیع ناممکن ہے۔

ٹائیٹل مضمون کے لحاظ سے بدلتا رہے تو بہتر ہوگا۔ منصف مبارکپوری صاحب کی نظم کافی پسند آئی۔

والسلام۔ طارق احسن فلاحی۔

مدیر محترم! السلام علیکم۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

"حیات نو" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ شکریہ۔ اداریہ "عمل سے زندگی...." مختصر مگر بیحد اہم ہے۔ خدا کرے آپ کی آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہو (حالانکہ مسلمانوں کی بے حسی اور بے عملی (بدعملی) سے اسکی امید کم ہے مگر خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہوا جاسکتا) اللہ تعالیٰ ہمیں حسن عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حلقۂ یاراں کے تحت مرسلہ حسین صاحب نے صحیح مشورہ دیا ہے کہ حیات نو میں زبان کی سادگی اور آسان الفاظ کے استعمال کو اپنا طریقہ بنائیے۔ تحریری مذاکرے کا سلسلہ واقعی بہت اچھا رہیگا اس جانب مزید سنجیدگی سے غور فرمائیے۔ البتہ "تعارف وتبصرہ" کے متعلق ان کے خیال سے اتفاق نہ کیجئے تو بہتر ہوگا۔ والسلام

عطا عابدی۔ دربھنگہ

تعلیم وتعلم

صحیح البخاری اور ابن حجرؒ کی فتح الباری

ولی اللہ سعیدی فلاحی

صحیح البخاری

اس کی تالیف امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری (۱۹۴ھ/۸۱۰م - ۲۵۶ھ/۸۷۰م) نے کی اور اس کا نام "الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" رکھا۔ یہ حدیث کی سب سے جامع اور اہم کتاب ہے۔ علماء کا کہنا ہے کہ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب بخاری ہے۔ بخاریؒ نے بہت احتیاط کے ساتھ احادیث کی تخریج کی ہے اور صرف ان احادیث کے نقل کرنے کا التزام کیا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بسند صحیح مروی ہوں۔ غیر مکرر احادیث کی تعداد صرف ۴۰۰۰ ہے اور مکرر احادیث تقریباً ۷۲۷۵ ہیں۔

بخاریؒ کے نزدیک صحیح بخاری کے تالیف کرنے کا دو مقصد تھا۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کو جمع کرنا۔

۲۔ ان احادیث سے فقہی مسائل مستنبط کرنا۔ اسی بناء پر ہم صحیح بخاری میں احادیث اور آیات قرآنی سے مستنبط فقہی مسائل پاتے ہیں۔

بخاریؒ نے اپنی صحیح کو کئی کتابوں میں تقسیم کیا ہے جیسے کتاب بدء الوحی وغیرہ۔ اور ہر کتاب کے تحت ابواب بھی باندھے ہیں۔ صحیح بخاری میں کتاب کی تعداد ۹۷ اور ابواب کی تعداد ۳۴۵۰ ہے۔

بخاریؒ کی ایک بڑی خصوصیت ترجمۃ الابواب کی ہے۔ باب سے حدیث کے ربط کے سلسلہ میں دقت نظر اور وسعت فہم کی ضرورت ہوتی ہے۔

صحیح بخاری پر کافی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ چند اہم شروح وحواشی مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری۔ لابن حجر العسقلانیؒ۔

۲۔ عمدۃ القاری ـــ للعینی (الحافظ بدر الدین عینیؒ)
۳۔ ارشاد الساری الی صحیح البخاری ـــ للقسطلانیؒ
۴۔ تیسیر القاری شرح البخاری ـــ للشیخ نور الحق بن الشیخ عبد الحق المحدث الدہلویؒ
۵۔ شرح البخاری ـــ للشیخ الاسلام عبد الحق المحدث الدہلویؒ
۶۔ بہجۃ النفوس شرح البخاری ـــ للحافظ ابن ابی جمرۃؒ
۷۔ روح التوشیح علی صحیح البخاری ـــ للشیخ علی بن سلیمانؒ
۸۔ شروح البخاری ـــ للنوویؒ وغیرہ
۹۔ الحواشی علی جامع الصحیح ـــ للشیخ العلامۃ احمد علی السہارنپوری و مولانا نانوتویؒ
۱۰۔ فیض الباری علی صحیح البخاری ـــ علامہ محمد انور شاہؒ الکشمیری
۱۱۔ انوار الباری (اردو) شرح صحیح البخاری ـــ مجموعہ افادات انور شاہ کشمیریؒ و دیگر اکابر محدثین مؤلف مولانا سید احمد رضا

صحیح بخاری کی منتخبات بھی کافی ہیں۔ چند اہم مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مختصر احمد بن عمر القرطبی
(۲) مختصر عبد اللہ بن سعد بن حمزۃ الاندلسی
(۳) مختصر ابن حبیب الحلبی
(۴) مختصر الشرجی الزبیدی

۱۔ فتح الباری۔ شرح البخاری۔ للحافظ ابن حجر العسقلانی

ابن حجرؒ ـــ کا پورا نام شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی الکنانی العسقلانی ہے آپ ابن حجر المصری الشافعی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ آپ ۷۷۳ھ میں مصر میں پیدا ہوئے اور ۸۵۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

آپ جلیل القدر محدث تھے۔ اس وقت علم و معرفت میں آپ کو مرجع کی حیثیت حاصل تھی

آپ نے کئی تالیفات چھوڑی ہیں۔ چند اہم مندرجہ ذیل ہیں:
(۱) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (۲) ہدی الساری مقدمۃ فتح الباری (۳) فتح الباری شرح البخاری

فتح الباری کی خصوصیت

یہ تفسیر دس جلدوں میں ہے اور اس کا مقدمہ ہدی الساری ایک جلد میں ہے۔ ہدی الساری میں دس فصلیں ہیں۔ ہدی الساری فوائد علمیہ، نکات ادبیہ اور مسائل فقہیہ سے بھرا پڑا ہے۔

فتح الباری کے سلسلے میں ہدی الساری میں ہے:

فانہ لا یمارہ شک فی ان فتح الباری للامام الحافظ ابن حجر قد فاق السہب عنہا والمختصر فی الدقۃ والوفاء بالغرض المقصود فضلا عن سلامۃ الاسلوب و جمیل الصفۃ والعبارات التی تملک زمام النفوس، وتملؤھا بہجۃ واختیالاً۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ امام حافظ ابن حجر کی فتح الباری بلند پایہ شرح ہے اور اسلوب کی سلامتی، انداز بیان کی خوبصورتی اور نفوس میں سرور و انبساط کی کیفیت پیدا کرنے کے ساتھ دقت نظر اور مفہوم و مدعا کو پوری طرح ادا کرنے کی صفات سے متصف ہونے کی وجہ سے ممتاز ہے۔

اس تفسیر کا خواج کچھ اس طرح ہے:

۱۔ ابن حجرؒ روایتوں کا اختلاف ذکر کرتے اور اپنی رائے بھی ذکر کرتے ہیں۔ خصوصاً متن روایت میں روایتوں کے اختلافات کو ذکر کرتے ہیں۔
۲۔ لغات سے الفاظ کی تخریج کرتے ہیں۔ لغوی اور شرعی تعریف بھی کرتے ہیں۔
۳۔ اسماء رجال پر بھی سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔
۴۔ مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور ان مسائل کا بھی ذکر کرتے ہیں جو اس سے نکل سکتے ہیں۔ دلائل بھی دیتے ہیں۔
۵۔ ابن حجرؒ، تکمیل، تنبیہ، اور فائدہ کی سرخی لگا کر فوائد، نکات اور موضوع کے متعلق خاص خاص چیزیں ذکر کرتے ہیں۔
۶۔ زیر بحث موضوع سے ابھرنے والے سوالات کو خود ذکر کرتے اور اس کا مدلل جواب لکھتے ہیں۔

نوجوان و طلبہ تحریک کا میقاتی منصوبہ۔ امکان کی روشنی میں

صباح الدین ملک فلاحی

انسانی تاریخ بے شمار نظریاتی انقلابات کی حامل ہے لیکن ان تمام انقلابات میں انبیائی انقلابات کو جو عظمت، وسعت اور ہمہ گیری حاصل ہے دوسرے انقلابات ان سے یکسر خالی ہیں اور ان انبیائی انقلابوں میں بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا برپا کیا ہوا انقلاب جس قدر عظیم الشان ہمہ جہتی، وسیع الاثر اور دور رس نتائج کا حامل ہے جس کی کوئی مثال نہ ماضی، حال اور مستقبل سے ملنا مشکل ہے۔ آج چودہ صدی بعد ہم پھر وہی انقلاب لانا چاہتے ہیں لہٰذا لازمی طور پر ہمیں ان ہی خطوط کار اور لائحہ عمل کو اختیار کرنا چاہئے جو اس انقلاب کی کامیابی کے لئے آج سے چودہ سو سال قبل اختیار کیا گیا تھا لیکن حالات کے تغیر نے انقلاب کے راستے بھی بدل دیئے ہیں۔ طریقۂ انقلاب کے تعین میں ان دو باتوں کا خیال کرنا انتہائی ناگزیر ہے۔ اول یہ کہ ہم انقلاب کے لئے بنیادی طور پر ان ہی اعمال اور وسائل و ذرائع کو اختیار کرنے کے پابند ہیں جو انبیائی تحریکات اور انبیاء کی انقلابی کوششوں کی روشنی میں صحیح و درست ہوں۔ دوسرے یہ کہ ہم انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے ہر اس طریقہ اور تدبیر کو اپنائیں جو قرآن، تاریخ انبیاء، اسوۂ رسول ﷺ اور خلفائے راشدین کے اختیار کئے ہوئے اصولوں کے مغایر نہ ہو۔ ہر وہ ذریعہ و وسیلہ جس کے ناجائز ہونے کا ثبوت نہ ہو یا اس کے حرام ہونے کا اشتباہ نہ ہو اسے ہم بلا چوں و چرا قبول کر لیں۔

مذکورہ بالا امور کی روشنی میں ہمیں اپنی انقلابی فتح مندی کے لئے ان انبیائی انقلابات کا مطالعہ کر کے ان خطوط کو اجاگر کرنا چاہئے جو آج کے حالات میں استعمال کئے جا سکیں۔ دوسرے یہ کہ غیر اسلامی و لادینی، کمیونسٹ نیز دیگر نظریاتی انقلابوں کا گہرا مطالعہ کر کے وہ جائز، مباح اور اخلاقی طریقوں اور تدابیر کا علم حاصل کرنا چاہئے جنہیں سائنس و ٹیکنالوجی اور علوم و فنون کے اس دور میں اپنے مقصد کے لئے استعمال میں لایا جا سکے۔

پھر اس سلسلہ میں انقلابی منصوبوں کو دو مراحل میں تقسیم کر لینا چاہئے ایک طویل المدت اور دوسرے قلیل المدت منصوبے۔ ہم یہ بھی طے کریں کہ انقلابی جد و جہد مخالف نظریات اور حریف قوتوں کے مقابلہ میں کن محاذوں پر کی جائے گی۔ محاذوں کی تعیین کے بعد ان محاذوں پر نبرد آزما افراد کی تیاری بھی خاص توجہ کی مستحق ہوگی اور اس کے لئے ہمہ گیر و عمومی و تربیتی پروگراموں کا زیر عمل لانا بھی ناگزیر ہے۔

منصوبے بنانے سے پہلے اپنے اس قلبی تعلق کا جائزہ ضرور لینا چاہئے جو ہمارے اسلامی انقلاب کے ساتھ ہے اور جب یہ معلوم ہو جائے کہ واقعتاً ہماری زندگی کا آخری مقصد انقلاب ہی ہے تو ہمیں منصوبے اس پہلو سے بنانے چاہئیں کہ ہم قلیل سے قلیل عرصہ میں زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں، ہمیں منصوبہ بناتے وقت اپنے نفس، اپنے مزاج، اپنی ذاتی مصلحتوں اور حالات کے مزاج کا لحاظ کرنے کے بجائے محض انقلاب کے تقاضوں کی رعایت کرنی چاہئے۔ انداز نظر یہ اختیار کرنا چاہئے کہ منصوبہ انقلاب ہم سے ایک متعین عرصہ میں کیا کچھ چاہتا ہے اگر ہم انقلاب کے مطالبہ کو پورا کرنے کا دم خم رکھتے ہوں تب ہی کہیں کہ واقعی معنوں میں ہم ایک انقلاب کے علمبردار ہیں لیکن اگر اس کے بجائے ہم انقلابی سرگرمیوں کو اپنی خواہشات کے تابع کر دیں تو یقین کر لینا چاہئے کہ ہم انقلاب لانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ انقلاب کا اپنے علمبرداروں سے اولین تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے عام افراد سے بالکل الگ، یکسر مختلف اور سراپا ممتاز ہوں۔ وہ عام انسانوں کے درمیان رہیں مگر انھیں بدلنے کے لئے وہ شہروں اور آبادیوں میں زندگی گزاریں مگر ان کے پورے نظام اور سرگرمیوں کو اپنے نظریے کے تابع کرنے کے لئے۔ ان کی ہر حرکت اور ہر عمل کا سر رشتہ اپنے آخری مقصد یعنی انقلاب سے جڑا ہوا ہو۔ اس کی خواہشات انقلاب کے تابع ہوں اور اس کی ہر متاع انقلاب کے لئے وقف ہو۔ اگر ہم اپنے کو ایسا سمجھتے ہیں تو ہمیں یہ حق ہے کہ آئندہ میقات کے لئے منصوبہ بنائیں، ایک امکانی منصوبہ جو عام انسانوں کی نظر میں فی الواقع ممکن نہ ہو لیکن انقلابیوں کی نگاہیں آئندہ اس منصوبہ پر اپنے دست و پا کو حرکت کرتا ہوا دیکھیں۔ ظاہر ہے کہ انقلاب عام انسانوں کے نزدیک ہمیشہ غیر ممکن ہی ہوا کرتا ہے

اور انقلاب کے علمبردار اس ناممکن کو ممکن بناتے رہے ہیں۔ ناممکن کو ممکن بنانا ہی تو اصل میں انقلاب ہے۔

آئیے! اب ہم دیکھیں کہ انبیاء کی زندگی میں انقلابی مقاصد کے لئے ہمیں کیا مواد ملتا ہے۔

بنیادی طور پر تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد بندوں پر خدا کی جانب سے اتمام حجت رہا ہے۔ مگر اتمام حجت کے عملی مظاہر مختلف رہے ہیں۔ بعض انبیاء نے اپنی دعوت و تبلیغ کو سیاست و حکومت کے عملاً حصول تک پہنچایا اور بیشتر کی دعوتی سرگرمیاں اس سے پہلے ہی ختم ہو گئیں۔ عموماً سیاست و حکومت کے مرحلہ پر پہنچنے سے پہلے ہی بیشتر قومیں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ ان انبیاء میں جنھیں ملک کی سیاسی باگ ڈور سنبھالنے کا موقع ملا سب سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اس کے حصول کی شکل یہ رہی کہ وہ پوری قوم مصر کے لئے ایک محسن بن کر ابھرے اور قوم نے بلا شرط تخت حکومت انھیں سپرد کر دیا۔ حضرت یوسف ؑ نے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ خدا کی حکومت قائم کر دی۔ دوسرے حضرات داؤد و سلیمان علیہم السلام ہیں جنھوں نے اسلامی حکومتیں قائم کیں۔ آخر میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی سیاست و اقتدار تک رسائی ایک کھلا ہوا واقعہ ہے جس کا کوئی جز ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہے۔ اس کے بعد خلفائے راشدین کا تیس سالہ دور خلافت ہے جو ہماری رہنمائی کیلئے بالکل کفایت کرتا ہے۔

ان تمام ماخذوں پر غور کرنے سے کئی مستحکم اصول ہمیں ملتے ہیں:

ایک یہ کہ ان سب کے انقلاب کی بنیادی دعوت یہی ہے کہ لا حکم الا للہ خدا کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے۔ اس دنیا میں حکومت اور سیاست صرف خدا کی اطاعت کی بنیاد پر قائم ہونی چاہیے۔ کسی انسانی گروہ کو حق نہیں ہے کہ وہ خدا کے ملک پر اپنی ناجائز حکومت قائم کرے ایسی تمام باطل حکومتوں کو صفحۂ ہستی سے محو کر دینا بہر صورت اسلامی حکومت کا اور اہل اسلام کا فرض ہے۔ اس کے لئے ہر جائز طاقت استعمال کرنا محمود و مستحسن ہے لا اکراہ فی الدین کا مطلب عقیدہ کی انفرادی آزادی ہے نہ کہ کسی گروہ کو اپنی ناجائز حکومت قائم کرنے کی آزادی۔

دوسرے یہ کہ حکومت و سیاست کی مشینری کو تبدیل کرنے کے لئے اس کے سوا کسی شرط کی ضرورت نہیں ہے کہ اس تبدیلی سے امن و امان پیدا ہو، انارکی نہ پھیلے۔ اگر باطل حکومت کے مقابلہ میں حق کی حکومت لانے کے دوران یا قیام کے بعد امن و امان کی حالت

بدتر ہو جاتی ہو تو پھر یہ عمل جائز نہ ہوگا لیکن اگر حق پسندوں کا قلیل التعداد گروہ حکومت کی مشینری کو ہاتھ میں لے کر امن و امان بحال رکھ سکتا ہو تو اس موقع سے انتفاع میں بے جا تاخیر بھی مناسب نہیں ہے۔

انبیائی انقلاب کے علمبردار ہمیشہ ایک مستحکم تنظیم کی شکل ہی میں آگے بڑھتے ہیں اور ان کے پیرووں کی تنظیم کی بنیاد یہ دعوت رہی ہے کہ تحریک کے لئے جان و مال، دنیا جہان سب کچھ قربان کر دیا جائے۔

ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین۔ یہ واقعہ ہے کہ انقلاب کے لئے ایک مضبوط تنظیم شرط اولین کی حیثیت رکھتی ہے اور تنظیم اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک انقلاب کے داعیوں میں انقلاب کا عشق اور اس کے لئے اپنی ہر شے قربان کر دینے کا جذبہ نہ ہو۔ انبیاء کے ساتھ جد و جہد کرنے والوں میں یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ انصار و مہاجرین کے عظیم الشان انقلاب ان ہی تنظیمی اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

غیر اسلامی انقلابوں کے مطالعے سے ہمیں اصولی استفادہ نہیں بلکہ فروعی استفادہ کرنا ہے لیکن اسی حد تک جہاں تک اسلامی اصول اس کی اجازت دیتے ہوں۔ دور حاضر کا سب سے بڑا انقلاب جو منظم اور نظریاتی بنیادوں پر برپا ہوا وہ کمیونسٹ انقلاب ہے۔ اس انقلاب کی تفصیلات بھی لاکھوں صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کمیونزم کے علمبرداروں نے اپنے انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے کون کون سے داؤ پیچ اختیار کئے ہیں اور اپنے مخالفین کو مات دینے کے لئے کون کون سے محاذ کھڑے کئے ہیں اس کا مطالعہ ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ ان میں اگر کچھ مفید اور کارآمد تدابیر ہوں تو ان کو ہم بھی اپنے مقصد کے لئے جائز طور پر استعمال کر سکیں کیونکہ الحکمۃ ضالۃ المومن۔ مزید اس لئے بھی کہ یہی کمیونسٹ نظریاتی اور سیاسی میدان میں ہمارے سب سے بڑے حریف ہیں۔ دشمن کو دشمن ہی کی چالوں سے شکست دینا، یہ اصول بھی کمیونسٹ چالوں سے واقفیت حاصل کرنے پر ہمیں ابھارتا ہے۔

اب ہمیں وہ محاذ متعین کر لینے چاہئیں جہاں پر ہمیں دشمن سے مورچہ لینا ہے۔

بنیادی طور پر تین محاذوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ مضبوط تنظیم کا قیام، رائے عامہ کو ہموار کرنا اور حکومت کی طاقت کا حصول۔

ایک مضبوط تنظیم کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ تنظیم کے افراد سے بھرپور اور سرگرم ACTIVITIES کا مطالبہ کیا جائے۔ افراد کی تربیت کے لئے بیشتر الگ سے تربیتی پروگرام رکھنے کے بجائے عموماً پروگرام کو دعوتی بنا دیا جائے۔ اپنے اوقات محض سیکھنے میں صرف کرنے کے بجائے زیادہ سکھانے میں لگایا جائے۔ سکھانا دراصل سیکھنے ہی کا اگلا مرحلہ ہے۔ وہ تقریر جو تربیتی اجتماع میں کی جاتی ہے اور وہ حدیثیں جو وہاں سنائی جاتی ہیں اسی تقریر اور ان ہی حدیثوں کو عوام کے سامنے سنایا اور کہا جائے۔ مضبوط تنظیم کا قیام دراصل ایک وسیع دعوتی میدان میں سرگرم ہونے اور ہر طرح کی قربانیاں دینے سے ہی عمل میں آسکتا ہے۔ ایک مضبوط تنظیم ہی سے رائے عامہ کو انقلاب اسلامی کے لئے ہموار کر سکتی اور بالآخر تبدیلیٔ اقتدار کے مرحلہ تک پہنچا سکتی ہے لیکن خود وہ تنظیم بھی اسی وقت ایک مضبوط تنظیم بن سکتی ہے جب وہ رائے عامہ کو ہموار کر کے حکومت کے اقتدار کو صالحین کے ہاتھوں میں پہنچانے کے لئے میدانِ عمل میں کود پڑے۔ ان دونوں میں دراصل لازم و ملزوم کا تعلق ہے۔ جن کا وجود ایک دوسرے کے بغیر ممکن نہیں۔

رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے مختلف محاذوں پر انتھک جد و جہد کی ضرورت ہوگی کیونکہ اس کام میں معاند نظریات سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ رائے عامہ پر قابو پانے کے لئے دعوتی میدان کے تین ذیلی محاذوں پر سرگرم اور جان توڑ کوشش درکار ہوگی۔ صحافتی و تصنیفی محاذ، خطابت و عام ذرائع ابلاغ کا محاذ اور رابطہ عامہ کا محاذ۔ یہ تینوں محاذ تحریکِ انقلاب کی روح ہیں۔ صحافت، تصنیف، خطابت، ذرائع ابلاغ اور رابطہ عامہ ان سب سے اشاعتِ افکار (پروپگنڈہ)، تنقید و تبیین (ایجی ٹیشن) اور تربیت و تنظیم کا زبردست کام لیا جا سکے گا۔ پروپگنڈے کا مطلب یہ ہے کہ مختلف خیالات کو مؤلف و خطیب یکجا کر کے پیش کرے۔ اس کے لئے ضروری نہیں ہے کہ ہر کوئی ساری باتیں سمجھے لیکن ناقد و صحافی صرف ایک خیال کو مدلل انداز میں پیش کرے اور اپنی پوری تقریر اور گفتگو کو اسی ایک بات کے گرد پھیلا دے۔

رابطہ عامہ کی ایک قدرے مؤثر شکل جماعتِ تبلیغ کی چلت پھرت سے ابھری ہے۔ دروازے دروازے ایک ایک فرد تک پیغام رسانی اور بہتر نتائج کی تنظیم تیسرا انتہائی اہم ذیلی محاذ ہے جس سے کوئی انقلاب صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ مذکورہ تمام ہی ذیلی محاذوں پر مختلف قسم کے مخالفین کی مزاجی کیفیات، لسانی تغیرات اور عقائدی اختلافات کا لحاظ از بس ضروری ہوگا۔

اقتدارِ حکومت کے حق پسند ہاتھوں میں منتقلی کے لئے مضبوط تنظیم اور رائے عامہ کے علاوہ مختلف دوسرے محاذوں پر بھی پیش قدمی انتہائی ضروری ہے۔ انتخابی سیاست کو اس طرح استعمال کیا جانا چاہئے کہ وہ تحریک کے مفاد و مقاصد کے لئے مفید ہو سکے۔ مسلمانوں کے ملی و مذہبی مسائل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کمزور طبقات اور ملک کے دیگر مسائل سے اغماض برت کر بھی کوئی انقلاب پروان نہیں چڑھ سکتا۔ حکومت کے اہم محکموں، مناصب اور ملازمتوں نیز تعلیمی اداروں میں منصوبہ بند طریقہ سے داخل ہونا بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ یہ اذہان و قلوب کی تعمیر کا سہل ذریعہ ہے۔ میونسپلٹی اور دیگر سماجی و اصلاحی ادارے جو شہری و دیہی علاقوں میں کام کرتے ہیں ان میں شمولیت بھی ہمارے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ اس طرح کے بے شمار دریچے اور گوشے ہیں جن کے ذریعہ ہم حکومت کے ایوان میں قدم جما سکتے ہیں اور بالآخر اسے ایک صحیح سمت عطا کر سکتے ہیں۔

اوپر جو منصوبے اور کام بیان ہوئے ہیں ان میں بیشتر تو ایسے ہیں جو مستقل کرنے کے ہیں ان میں فوری منصوبے بھی ہیں اور طویل المدت بھی۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے مسائل بھی درپیش ہیں جو اپنے حل کے لئے وقت کے متقاضی ہیں لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے کافی اہم ہیں مثلاً مسلم اداروں، تنظیموں اور جماعتوں میں ہم آہنگی اور تال میل۔ عربی و دینی درسگاہوں کی رہنمائی کے لئے ایک متفقہ و مستند بورڈ۔ ہندوستان کی نوجوان طلبہ تنظیموں کا اتحاد۔ مسلم یونیورسٹی میں مدارس کے فارغ طلبہ کی ایک آزاد تنظیم کا قیام جو بالآخر کل ہند سطح پر علماء کے باہمی اتحاد کا موجب بن سکے۔

مذکورہ بالا امور کا ایک پہلو یہ ہے کہ آیا یہ سارے کام نوجوان تنظیم اپنے ذمے لے یا ان میں تحدید کرے۔ دراصل یہ نظری سے زیادہ ایک عملی سوال ہے اور اس کا بہترین جواب ہے: عمل (ACTION)۔ ●●

قسط ۲

سیّد قطب شہیدؒ کی قرآنی خدمات

عبید اللہ فہد، ریسرچ اسکالر، شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مناظرِ قیامت

یہ سید قطبؒ کی دوسری تصنیف ہے جو قرآن کے ادبی جمال اور تصویری اسلوبِ بیان کی وضاحت کیلئے لکھی گئی ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں قیامت کے مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان سب کو مصنف نے اس لازوال تصنیف میں جمع کر دیا ہے۔ "مشاہد القیامۃ فی القرآن" ایک سو بچاس مناظر پر تفصیلی گفتگو کرتی ہے۔ مشاہد وہ ہیں جن میں صورت، حرکت، اور ہم آہنگی کی کثرت موجود ہو۔ وہ مقامات جہاں آخرت کے دن کا محض ذکر ہوا ہے یا جنت کے اندر ٹھہرنے یا بیٹھنے کی بات ہوئی ہے یا عذاب الیم، عذاب عظیم یا عذاب مہین کا تذکرہ کیا ہے بغیر اس کے کہ اس کا کوئی اثر دل و دماغ پر مشخص یا متحرک شکل میں مرتسم ہو ایسے مقامات سے سید قطب نے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔

مصنف نے آخرت کے ان مناظر کی ترتیب و تحریر میں تاریخی ترتیب کا لحاظ کر کے حتی الامکان استقرائی طریقہ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ جس ترتیب سے جو سورتیں نازل ہوئی ہیں اور جن میں ان کا ذکر آیا ہے اسی ترتیب سے انھیں پیش کیا گیا ہے، اور سورتوں کی ترتیب بھی وہی رکھی گئی ہے البتہ کہیں کہیں انتشار ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان مناظر کو ان کے تاریخی پس منظر کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن تفصیل سے گریز کیا گیا ہے کیونکہ یہ چیز پورے قرآن کے احاطہ و استقصا کا تقاضا کرتی ہے جو ایک مختصر تصنیف میں ناممکن ہے۔

عالم آخرت کا عقیدہ طبعی طور پر انسانی ضمیر کی گہرائی میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ اسے ضمیر کی بیداری کا پیمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے کے عقائد و نظریات میں بھی یہ تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ چنانچہ اس عقیدے کی طویل تاریخ پر ایک مختصر فصل کے ذریعہ کتاب کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے جس میں قدیم اہل مصر، زردشت، قدیم اہل یونان، ہندومت، بدھ مت وغیرہ کے ساتھ

بنی اسرائیل، عیسائیت اور عربوں کے یہاں آخرت کے جو تصورات رائج تھے ان پر بڑی قیمتی گفتگو کی گئی ہے اور اس تصور کے طویل تاریخی ارتقاء کے اہم نقوش اجاگر کئے گئے ہیں جس پر اہل علم کو مزید تحقیق و تالیف کرنے کی ضرورت ہے۔

کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے اس اسلوب کی بہترین وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"قرآن کے اسلوب بیان میں تصویر کشی ایک بہترین ذریعۂ افہام ہے۔ یہ کسی ذہنی خیال، نفسیاتی کیفیت، محسوس واقعہ اور آنکھوں کے سامنے کے منظر، نیز انسانی نمونے اور بشری طبیعت کی خیالی صورت میں بہترین حکایت کرتی ہے۔ پھر یہ تصویر کشی پردۂ ذہن پر مرتسم خیالی صورت کو مزید ترقی دے کر ٹھوس اور مجسم زندگی عطا کرتی ہے یا نمو و حرکت بخشتی ہے تب یہ ذہنی خیال ایک ہیئت یا حرکت کی شکل اور نفسیاتی حالت ایک وسیع پردہ یا منظر کی حیثیت اور جسم انسانی ایک زندۂ جاوید ہستی اور طبیعت انسانی ایک مرئی جسم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مختلف حادثات و واقعات اور مختلف کیفیات و مناظر مشخص صورت میں آنکھوں کے سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں زندگی بھی ہوتی ہے اور حرکت بھی۔"[۳۶]

اسی کتاب میں مصنف نے اپنی دیرینہ آرزو بھی بیان کی ہے کہ قرآن کو جدید اسلوب میں پیش کیا۔ اس کے خالص ادبی اور فنی حسن و جمال کو حیات آفریں تازگی عطا ہو، اس کی تعلیمات کو غیر ضروری تفریعی موشگافیوں اور کلامی پیچیدگیوں کے انبار سے آزاد کیا جائے، اور ان اغراض و مقاصد کو واضح کیا جائے جن کی خاطر قرآن نازل ہوا ہے۔[۳۷] مصنف کا یہی وہ ارادہ ہے جو "فی ظلال القرآن" کی صورت میں عملی جامہ پہن کر بعد میں ظاہر ہوا۔

تفسیر قرآن کا پس منظر

قرآن کے حسین و جمیل معانی اور تصویری اسلوب بیان کو مصنف دوران مطالعہ سمیٹتے رہے، اس کے اعجاز و ایجاز کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے اور ان کا قلب و ذہن کتاب الٰہی کے جمال میں غوطہ لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ "التصویر الفنی" اور "مشاہد القیامۃ" کی تصنیف کے بعد معاً ذہن میں خیال آیا کہ جو آرزو برسوں سے کروٹیں لے رہی تھی کیوں نہ اس کی تکمیل کی کوشش کی جائے اور مطالعہ کے دوران طاری ہونے والے تاثرات و احساسات کو بھی قلمبند کر دیا جائے کہ قرآن کی ایک ایک آیت میں دعوت و اصلاح، تنبیہ و تذکیر اور عرفان کے جو بحر ناپید کنار موجزن ہیں، ان کا عکس کاغذ کے صفحات پر منتقل

ہو سکے۔ پھر یہ ہوا کہ ایسا ہوا کہ ۱۹۵۰ء میں استاذ سعید رمضان نے مجلہ "المسلمون" نکالنے کا فیصلہ کیا تاکہ حسن البنّا شہید کے رسالہ الشہاب کے خلا کو پُر کر سکے۔ ایڈیٹر نے مختلف مضمون نگاروں اور مقتدر شخصیات سے رابطہ قائم کیا اور ان کی توجہات اور قلمی تعاون حاصل کیا۔ انہی میں ایک مصنف شہید بھی تھے جنھوں نے "فی ظلال القرآن" کے کالم کے تحت مستقل مسلسل لکھنے کا وعدہ کیا اور اس طرح قرآنی خواطر و جذبات کو صفحہ میں منتقل کرنے کا اچھا موقع مصنف کے ہاتھ آیا۔

ابھی چند ہی قسطیں شائع ہوئی تھیں کہ مبارکباد اور تہنیت کے پیغامات ملنے شروع ہوئے۔ ناشروں نے بازار کی مانگ دیکھ کر ان قسطوں کو شائع کرنے کا بندوبست کیا۔ مصر کے ادارہ دار احیاء الکتب العربیۃ نے مصنف سے معاہدہ کیا کہ ایک خطیر رقم کے عوض ہر ماہ "فی ظلال القرآن" کی قسطیں اس کے حوالہ کر دیا کریں۔ مصنف نے عزم و ہمت، مطالعہ و تجربہ، اور ادب و بلاغت کی تمام صلاحیتوں کو کام میں لا کر اس پروجیکٹ کی تکمیل کی کوشش کی اور جنوری ۱۹۵۴ء تک تفسیر کے سولہ حصے مکمل ہو گئے لیکن مصر کے حالات نے اس انقلابی مصنف کو چین سے کام نہ کرنے دیا اور جیل کے دروازے پھر ایک بار وا ہو گئے لیکن تعذیب و ابتلاء کے مرحلہ سے پہلے جیل میں جب لکھنے پڑھنے کی تھوڑی سی اجازت ملی تو بقیہ تین جلدیں اور مکمل کیں۔ اس طرح گیارہ حصے تفسیر کے مکمل ہوئے۔

۱۹۵۴ء کی فصل گرما میں مردان انقلاب کے درمیان کچھ اختلافات کم ہوئے تو بہت سے سیاسی رہنماؤں کو نظربندی سے رہائی ملی اور سید قطب بھی جیل سے باہر آ گئے۔ ان کو قاہرہ سے نکلنے والے رسالہ "الاخوان المسلمون" کی ادارت کی ذمہ داری سونپی گئی اور سید شہید پھر حریت فکر کی شمع روشن کرنے کے جرم میں دوبارہ جیل بھیج دیے گئے اور پھر لیمان طرہ کے عذاب قانون میں منتقل کر دیے گئے۔ اب حرب و ضرب کا نیا مرحلہ شروع ہوا۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ موصوف نے صرف دو ماہ تک اس جریدہ کی ادارت کے فرائض سرانجام دیے تھے کہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۴ء کو کرنل ناصر کی طرف سے یہ رسالہ بند کر دیا گیا کیونکہ اس نے اخوان کی پالیسی کے تحت اس اینگلو مصری پیکٹ کی مخالفت کی تھی جو ۷ جولائی ۱۹۵۴ء کو جمال عبدالناصر اور انگریز وزیر کے درمیان ہوا تھا۔ اس پیکٹ کے بعد اخوان اور ناصر کے درمیان کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ ایک جعلی سازش کے الزام میں حکومت مصر نے اخوان کو خلاف قانون قرار دیا۔ اخوان رہنماؤں کو گرفتار کیا اور انھیں موت کی سزائیں دی گئیں۔ ان گرفتار شدگان میں سید قطب بھی تھے ۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء کو

مصر کی عوامی عدالت نے مصنف کو پندرہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ اس دوران دار احیاء الکتب العربیۃ نے حکومت کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ مصنف کی گرفتاری سے فی ظلال القرآن کا کام ایک دم رک گیا تھا اور پبلشر کو کافی مالی نقصان ہو رہا تھا۔ آخرکار جیل والوں کو حکم ملا کہ انھیں علمی مشاغل جاری رکھنے کی اجازت مل گئی۔ اس جزوی سہولت سے موصوف نے کافی فائدہ اٹھایا اور اپنی تفسیر فی ظلال القرآن کی ازسرنو تصنیف پر متوجہ ہو گئے لیکن حکومت نے ایک تحقیقی کمیٹی بھی تعینات کر دی اور اس کو یہ ذمہ داری سونپی کہ سید قطب جو کچھ لکھیں اس میں سے "غیر ضروری" اور "نامناسب" تحریریں حذف کر دے تاکہ نظام موجود پر اس سے کوئی حرف نہ آئے۔ بہرحال جبر و دباؤ کے اس ماحول میں سید نے اپنی تفسیر مکمل کی۔ سینسر کمیٹی نے سید قطب کی جن تحریروں کو روکا اور ان کی اشاعت پر پابندی لگائی تھی ان میں

سورۂ فجر کا مقدمہ اور سورۂ بروج کا وہ مقدمہ بھی شامل تھا جسے مصنف نے بعد میں معالم فی الطریق میں "ہذا ہو الطریق" کے باب کے تحت شامل کیا[۱] جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مخصوص حالات کے تحت مصنف نے تفسیر میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا یا جن کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی تھی وہ معالم کے صفحات میں موجود ہیں۔ منظم تحریک کی لازمی صفات، ایمان و کفر کی کشمکش، اہل ایمان کی راہ میں پیش آنے والی آزمائشیں اور جنگ ایمانی کی حقیقت، ماہیت وغیرہ نکات پر تفصیلی گفتگو معالم ہی میں موجود ملے گی۔

سید قطبؒ کا تفسیری انداز

سید قطبؒ نے اپنی ان تفسیری تحریروں کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ بعض قارئین سمجھتے ہیں کہ یہ بھی کوئی تفسیر ہے جس پر تفسیر کے چھاپ موجود ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو اسلام کے عام اصول و مبادی کی تعلیم ہے جو نزول قرآن کا مقصد ہے اور ایک فریق کہتا ہے کہ یہ کتاب دستور الٰہی کی تشریح اور نظام حیات کی توضیح ہے اور اس قانون کی حکمت و مصلحت بھی بتائی گئی ہے لیکن مصنف کے خیال میں ان میں سے کسی چیز کا ان کا ارادہ نہ تھا۔ انھوں نے تو قرآن کے سایہ میں رہ کر جن احساسات و خیالات کی دولت حاصل کی تھی انھیں ان سطروں میں پیش کر دیا ہے۔[۲] ان کی پوری کوشش رہی کہ لغوی و بلاغتی بحثوں سے اجتناب کریں۔ کلامی و فقہی مسائل سے تعرض نہ کریں کہ مصنف کے خیال میں ان مباحث سے ان کی روح قرآن تک نہ پہنچ سکتی تھی اور جو روحانی، اجتماعی و معاشرتی یا انسانی جذبات ان پر طاری ہوئے تھے وہ صفحات میں منعکس نہ ہو پاتے۔ چنانچہ ان چیزوں سے دامن بچا کر مصنف نے قرآن کے ادبی حسن، اس کے تصویری اسلوب بیان اور

طرز ادا و تعبیر اور نظم و نسق کی جمال آرائی پر توجہ مبذول رکھی ہے۔ مصنف کی ابتدا ہی سے خواہش تھی کہ التصویر الفنی کی طرح پورے قرآن کے حسن و جمال کو نکھار کر پیش کیا جائے کیونکہ مصنف کا خیال تھا کہ قرآن کی حسین و جمیل تعبیر کا واضح طریقہ منظر نگاری اور تصویر کشی ہے اور اسی روشنی میں پورے قرآن کو پیش کیا جانا چاہیے۔ یہ جذبہ پھر مدھم پڑ گیا تا آنکہ فی ظلال القرآن لکھنے کا موقع ہاتھ آیا اور تمنا حقیقت کا روپ دھار گئی۔

تفسیری خصوصیات

مصنف کا تعلق استاذ عبدہ، رشید رضا اور احمد مصطفیٰ مراغی کے اس جدید مکتب فکر سے ہے جس نے نئے انداز میں زمانہ کی ضروریات کے مطابق قرآن پاک کی اس طرح تفسیر کرنے کی کوشش کی کہ ہدایت و رحمت جو نزول قرآن کا اصل مقصد ہے، کے دروازے کھل سکیں۔ قارئین کتاب الٰہی کے اعجاز و ایجاز، سحر و بلاغت اور حسن و جمال سے متاثر ہو سکیں، فقہی و کلامی مباحث میں پڑ کر قرآن کے معانی و مفاہیم سے بے خبر نہ ہوں بلکہ نزول قرآن کے وقت جس طرح عرب اس کی ادبیت اور تاثیر کے گھائل ہو کر رہ گئے تھے اسی طرح آج بھی قارئین اس کا اثر محسوس کر سکیں، ان کے فکر و عمل میں تبدیلی پیدا ہو اور ان کی صبح و شام ایک نئے انقلاب سے آشنا ہو۔ سید قطبؒ اس مکتب فکر میں سب سے آگے اور ممتاز نظر آتے ہیں کہ ان کی تفسیر ظلال اس مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہے۔ ان کی یہ تفسیر جو فی ظلال القرآن کے نام آٹھ جلدوں میں چھپ چکی ہے، اصطلاحی معنوں میں کوئی تفسیر نہیں ہے بلکہ یہ دراصل ان تاثرات و خواطر سے عبارت ہے جو مطالعہ کے دوران مصنف پر طاری ہوئے۔ اگر ہم اس تفسیر کی خصوصیات پر مختصراً کچھ لکھنا چاہیں تو اسے مندرجۂ ذیل خصوصیات کا حامل قرار دے سکتے ہیں۔

۱۔ بلند ادبی اسلوب

تفسیر کا بلند پایہ ادبی اسلوب قدیم و جدید تمام مفسرین سے ممتاز ہے۔ جب بھی مصنف کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں خواہ دینی ہو یا فقہی، سیاسی ہو یا سماجی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادب و بلاغت کے پھول جھڑ رہے ہیں، شیرینی و اثر آفرینی دامنِ دل کو کھینچے لیتی ہے اور قرآن دل و دماغ پر نقش بن کر چھاتا جا رہا ہے۔ ایک طرف مصنف نے اپنی تفسیر کو ادبی پیرایہ عطا کیا ہے تو دوسری طرف قرآن کے ادبی و فنی محاسن بھی نہایت مہارت اور عمدگی سے واضح کر دیئے ہیں۔ سید قطب قرآنی آیات کی ادبیت، بلاغت اور

حسن اسالیب کی وضاحت کے ساتھ ان کے آہنگ کی نغمگی اور ترنم اور موسیقیت پر بھی قیمتی بحثیں کرتے اور مضامین آیت سے اس کے تعلق کو واضح کرتے ہیں۔ قرآنی اعجاز کو ایسی طرح وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو قرآنی ادب کی باریکیوں کو سمجھنے کے ساتھ کائنات میں خدائی حسن و جمال کے جلووں اور ذوق و وجدان کی تسکین کے سامانوں سے بھی دلچسپی رکھتے ہوں۔ مصنف نے اس تفسیر میں عام طالب اور قاری کو ان تمام پہلوؤں سے آشنا کرانے کے لئے قیمتی بحثیں کی ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ والضحیٰ کی سید نے جو تفسیر کی ہے آئیے اس کے حسن و جمال کا مشاہدہ کریں۔ سورہ کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں:[۳۵]

یہ سورہ اپنے موضوع، اپنے طرز تعبیر، اپنے مناظر، اپنے معانی اور اپنے آہنگ کے پہلو سے شفقت و رحمت کے جھونکے، محبت کے پیغام اور ایک غمگسار ہاتھ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصائب و آلام کی تکلیف کو دور کرتی، رحمت، رضا اور امید کی ہوائیں چلاتی اور یقین، طمانیت اور ٹھنڈک کو دلوں میں اتارتی ہے۔

یہ پوری سورہ خالصتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے۔ پوری سورہ آپ کے لئے آپ کے رب کی سرگوشی اور پیام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں آپ کے لئے تسلی اور راحت و طمانیت کا سامان ہے۔ پوری سورہ رحمت کا جھونکا، محبت کی شبنم، قربت کی الطاف و عنایات اور پریشان اور تھکی روح اور غمزدہ اور مضطرب دل کے لئے سکون و راحت کا سامان ہے۔

بہت سی روایات میں آیا ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا سلسلہ رک گیا تھا اور جبرئیلؑ کے آپ کے پاس آنے میں تاخیر ہو گئی تھی، اس پر مشرکین نے آپ پر چوٹ کی اور کہا کہ محمدؐ کو ان کے رب نے چھوڑ دیا ہے۔ تب یہ سورہ نازل ہوئی۔

وحی، حضرت جبرئیلؑ سے ملاقات اور اللہ سے ربط و تعلق، یہ چیزیں راہِ حق کی مشقتوں میں آپ کے لئے زادِ راہ، کفر و انکار کی شدید گرمی میں تشنگی رفع کرنے کا سامان اور تکذیب کی شدت و تکلیف میں آپ کے لئے سامانِ راحت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ انہی طاقتوں کے سہارے آپ مخالفت اور عداوت کی شدت اور سرکشی اور ظالم مشرکین کی سازشوں، فتنہ سامانیوں، تدبیروں اور اذیت رسانیوں کی شدید گرمی اور جھلسانے اور جلا دینے والی دوپہر میں زندہ اور ثابت قدم رہتے تھے۔ وحی رک گئی تو آپ کا زادِ راہ ختم ہو گیا، زندگی کے سرچشمہ سے آپ محروم ہو گئے، اور آپ کا دل

محبوب کے سلسلہ میں پریشان رہنے لگا اور آپ نفرت و مخالفت کی اس جھلسا دینے والی دوپہر میں کہ نادار، تشنگی دور کرنے کے کسی سامان اور محبوب دوست کی اس خوشبو کے بغیر، جس کے آپ خوگر تھے، تن تنہا بے یار و مددگار رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ تمام پہلوؤں سے آپ کے لئے شدید ترین اور ناقابلِ برداشت تھا۔

تب یہ سورہ نازل ہوئی اور اس نے دوستی، محبت، انس، قربت، امید، رضا، طمانیت اور یقین کی بارش برسائی:

وماودعک ربک وما قلیٰ۔ وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ۔ ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ۔ (والضحیٰ ۳:۴:۵)

تمہارے رب نے اس سے پہلے بھی تمہیں نہ چھوڑا، نہ وہ تم سے کبھی ناراض ہوا اور نہ اس نے کبھی اپنی رحمت، سرپرستی اور تحفظ و پناہ سے تمہیں کبھی محروم کیا۔

اسی طرح سید قطبؒ ادبی اسلوب میں اس سورہ کی دوسری آیات کی تشریح کرتے ہیں اور آخر میں اس کے ادبی حسن کی طرف یوں اشارہ کرتے نظر آتے ہیں:

"یہ شفقت، یہ رحمت، یہ رضا اور یہ دردمندی سب پھوٹی پڑتی ہیں اس لطیف عبارت سے جس کے الفاظ رقیق ہیں۔ اور اس آہنگ اور ترنم سے جو عبارت میں جاری و ساری ہے، جس کی حرکات مرتب، قدم سنجیدہ، آواز رقیق اور سُر خوش آہنگ اور دردمندانہ ہیں۔ جب اس لطیف شفقت، پرسکون رحمت، کامل رضا اور صاف شفاف دردمندی کے لئے فریم ورک بنانا چاہا تو خوشگوار چڑھتے دن اور پرسکون رات کا فریم بنایا جو رات اور دن کے سب سے زیادہ صاف و شفاف اوقات و لمحات ہوتے ہیں۔ یہ اوقات غور و فکر کے لئے بہت موزوں ہوتے ہیں۔ ان اوقات میں روح کا کائنات اور موجوداتِ کائنات سے ربط ہوتا ہے اور روح کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری کائنات مع کائنات کی عبادت میں معروف اور تسبیح اور مسرت اور صفائے قلب کے ساتھ اپنے خالق کی طرف متوجہ ہے۔ پھر ان امور کی تصویر کشی موزوں ترین الفاظ سے کی گئی۔ واللیل اذا سجیٰ۔ رات درحقیقت تو وہی ہے جو پرسکون ہے، نہ کہ مطلق رات جو وحشتوں اور تاریکیوں سے بھری ہوتی ہے۔ اس وقت رات پرسکون، رقیق اور صاف و شفاف ہوتی ہے اور اس پر لطیف دردمندی اور پرسکون

غور و فکر کا ایک ہلکا بادل چھایا ہوتا ہے جیسے کہ یتیمی اور ناداری کی تنہا، صاف شفاف اور خوشگوار چڑھتے دن کی آمد سے ہلکا بادل چھٹ جاتا ہے اور فضا صاف و شفاف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تصویر کے رنگ فریم کے رنگوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور ہم آہنگی کامل اور مطابقت مکمل ہو جاتی ہے۔[۲۳]

پھر سید اس سورہ کی قسموں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس خوشگوار اور دل کو متاثر کرنے والے اوقات کی قسم کھاتا ہے۔ اس طرح وہ کائنات کے مظاہر اور نفسِ انسانی کے احساسات میں ربط پیدا کر دیتا ہے۔ وہ قلبِ انسانی کو ایک ایسی زندگی بخشتا ہے جس سے اس حسین و جمیل اور زندگی سے بھرپور کائنات کا شعور ہوتا اور کائنات سے ہم کلام اور ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اس کائنات سے جو ہر زندہ شے پر مہربان ہے۔ اس طرح دل کائنات سے وحشت زدہ اور اجنبی و بیگانہ رہنے کے بجائے اس سے مانوس رہے گا۔ یہ چیز اس صورت میں بذاتِ خود مقصود ہے گویا اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سورہ کے آغاز ہی میں فرماتا ہے کہ آپ کے محبوب نے آپ کے پاس کائنات میں انس و محبت کو دوام کر دیا ہے اس لئے آپ نہ تنہا ہیں اور نہ بے یار و مددگار۔

مصنف کے بھائی استاذ محمد قطب نے تفسیر کے تیسویں پارہ کے انگریزی ترجمہ کا مقدمہ لکھتے ہوئے ان ادبی خصوصیات کی طرف بطورِ خاص توجہ دلائی اور آخر میں بڑے وثوق سے فرمایا کہ "ان (مصنف) کی زندگی کا آخری دور اس شدید جد و جہد کے لئے وقف تھا جس میں وہ پوری طرح محو ہو گئے تھے۔ اسلام کے عظیم مقصد کی خاطر انھوں نے اپنے افکار، اپنے احساسات، اپنے اقوال، اور راتوں اور دنوں اور درحقیقت اپنی پوری زندگی کو وقف کر دیا تھا لیکن کیا انھوں نے ادب اور آرٹ کے سلسلے کے اپنے احساسات کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا جو زندگی کے اولین دور میں ان پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے؟ نہیں۔ قرآن جس کے زیرِ سایہ مصنف نے زندگی بسر کی، خود اپنے اعلیٰ ادبی اسلوب کے لئے جو سب سے عمدہ و فائق ہے، معروف و ممتاز ہے۔"[۲۴]

سید قطب کے اس ادبی اسلوب کو ان کی عربی تحریروں کے ذریعہ ہی سمجھا جا سکتا اور ان سے محظوظ ہوا جا سکتا ہے کیونکہ مصنف جدید عربی ادب کے نقاد و ادیب تھے اور فی ظلال القرآن میں ان کا یہ ادب پورے شباب پر ہے۔ اسی لئے مصنف کا زورِ بیان اردو میں منتقل کرنا بہت دشوار ہے۔ پھر عربی میں مترادفات کے استعمال اور الفاظ و جملوں کا باہم مسلسل ربط کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اردو زبان

اس کے سامنے تنگ دامنی کا شکوہ کر کے رہ جاتی ہے۔ پھر بھی مندرجہ بالا تحریروں سے مصنف کی ادبیت اور کمال زبان کا تھوڑا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ پوری سورہ کو مربوط کرنے کی کوشش

سید قطب نے پوری تفسیر میں ایک مخصوص طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ پہلے سورہ کی تمہید بیان کرتے ہیں پھر سورہ کے موضوع سے بحث کرتے ہیں اور سورہ کے آخر میں پہنچتے ہیں تو ابتدائی مضامین سے اسے مربوط کر دیتے ہیں۔ اس طرح پوری سورہ میں ایک طرح کا نسق اور وحدت پیدا ہو جاتی ہے جس سے کتاب منزل کا اعجاز مزید نکھر کے سامنے آجاتا ہے۔

سورہ بقرہ کا مطالعہ اس مقصد کے لئے مفید ہوگا۔ آغاز کلام میں وہ لکھتے ہیں کہ ”مختصر ترین کلمات اور محدود سطروں میں تین قسم کے انسانوں کی تین مختلف ومتضاد تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر تصویر انسانوں کے ایک گروہ عظیم کا زندہ نمونہ ہے۔ نمونہ جو بنیادی بھی ہے اور حقیقی بھی اور ہر زمان و مکان میں اس کا کردار دہرایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر دور کی انسانیت ان تین تصویروں کے احاطے سے باہر نہیں جا سکتی۔

ان مختصر جملوں اور جامع سطروں میں یہ تصویریں پوری طرح واضح، روشن اور زندہ اور متحرک ہیں۔ ان کی علامات و نقوش جاگر ہیں، صفات منفرد و ممتاز ہیں۔ یہاں تک کہ ان وسیع اثر، سریع اللمس، محدود مربوط اور مترنم و ہم آہنگ جھلکیوں کو طویل سے طویل جملے اور وسیع سے وسیع سطریں بھی بیان نہیں کر سکتیں۔ یہ تصویریں ہیں متقین، کافرین اور منافقین کی۔

پھر ان تینوں تصویروں کو پیش کرنے کے بعد دنیائے انسانیت کو پہلی تصویر کے رنگ میں رنگنے کی دعوت دی ہے۔ اور بے ایمان انسانوں کو چیلنج کیا اور انھیں ہولناک عذاب کی دھمکی دی ہے اور دوسری طرف اہل ایمان کو نعیم عظیم کی بشارت سنائی ہے۔ یہ سورہ بقرہ کے بنیادی خطوط کی ایک اجمالی تعبیر ہے۔ آیئے ہم تفصیل سے ان نکات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ [۲۴]

پھر سورہ پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد آخر میں مصنف پہونچتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ: [۲۵]

یہ سورہ بقرہ کا اختتامیہ ہے۔ سورہ کی ابتدا ان آیات سے ہوئی تھی الٓمٓ۔ ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ۔ ھدًی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ

ومما رزقنٰھم ینفقون والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاٰخرۃ ھم یوقنون۔ (یہ الٓمٓ ہے۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں) اور سورہ کے آخری حصہ میں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اٰمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون کل اٰمن باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ وقالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر۔ (۲۸۵) (رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل کی گئی ہے اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ”ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک! ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔)

اس سورہ میں امت مسلمہ کی ذمہ داریاں گنائی گئی ہیں اور شرعی احکام وقوانین کی تفصیل آئی ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ واضح لفظوں میں اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ یہ ذمہ داریاں طاقت سے زیادہ نہیں ہیں۔ بقدر استطاعت ہی اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف بناتا ہے۔ اسے بندوں کی طاقت، صلاحیت اور احتیاج کا بخوبی علم ہے اور اس ہمہ گیر علم کی بنیاد ہی پر وہ امت مسلمہ کو ان فرائض کا حامل ٹھہرا رہا ہے۔ لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت۔ (۲۸۶)

سورہ میں بنی اسرائیل کی داستان تفصیل سے بیان ہوئی تھی اور اللہ نے ان پر جو انعامات کئے تھے اور ان کی جس ناشکری اور کفران کا ذکر کیا گیا تھا جس کے نتیجہ میں امامت عالم کی باگ ان سے چھین کر امت مسلمہ کے حوالے کی گئی ان سب پر شرح وبسط سے قرآن نے گفتگو کی تھی۔ اب آخر میں مسلمانوں کی زبانی اس حشر سے بچنے کی دعا اس طرح کرائی گئی۔ ربنا لا تؤاخذنا

إن نسينا أو أخطأنا، ربنا ولا تحمل علينا إصرًا كما حملته على الذين من قبلنا، ربنا ولا تحملنا ما لا طاقة لنا به، واعف عنا، واغفر لنا، وارحمنا أنت مولانا فانصرنا على القوم الكافرين۔ (اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ، ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلہ میں تو ہماری مدد کر۔)

آخر میں سید قطب ان مقامات کے اندر توافق اور وحدت پیدا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ سورہ مومن، کافر اور منافق کی تینوں تصویروں کی وضاحت سے شروع ہوئی تھی اور خاتمہ اس بات پر ہو رہا ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کی رضا کے لئے بغیر کسی ریا اور نفاق کے ایمانِ خالص کے علمبردار ہیں، انھیں کفار و منافقین پر فتح و نصرت کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اس طرح سورہ کے ابتدائی اور آخری حصوں میں ایسا تناسق اور باہم توافق پیدا ہو گیا ہے جو کسی انسانی کلام سے ماورا ہے۔[۴۳]

۳- سائنسی جدت طرازیوں کے سلسلہ میں اعتدالی موقف

قرآن اصلاً کتابِ ہدایت اور کتابِ انقلاب ہے۔ کفر و شرک اور الحاد و لادینیت کی تاریکیوں میں یہ مشعلِ صراطِ مستقیم کی روشنی دکھاتی اور انسانی ذہن و عمل کو تبدیل کرتی ہے۔ انذار و تبشیر اس کا مقصود ہے: نافرمانوں اور باغیوں کے لئے ڈراوا اور خدا ترسوں اور وفاداروں کے لئے بشارت ہے۔ یہ فرقان اور معیارِ حق و باطل ہے، کھرے کھوٹے کو الگ کرنا اور صحیح و غلط میں تمیز کرنا اس کے نزول کا مدعا و مطلوب ہے۔ خدا کی عظمت اور اس کی قدرت و علم کی نشانیوں کی طرف متوجہ کرانے کے لئے کائناتی مظہروں کی طرف اشارے بھی کئے گئے ہیں اور اس طرح کائناتی علوم بھی جا بجا قرآن میں بکھرے ہوئے ہیں۔ قرآن چونکہ خدا کا کلام ہے اور یہ بکھری ہوئی حسین و جمیل کائنات اس کی مخلوق ہے اس لئے دونوں میں تعارض ناممکن ہے۔ اس حیثیت سے علوم کی ترقی اور سائنسی نظریات کا ارتقا قرآنی آیات کے خلاف نہیں ہو سکتا لیکن سائنس کے تغیر پذیر نظریات اور ہر وقت تبدیلی کے لئے آمادہ تجربات و اکتشافات کا فکری ماحول ایسا نہیں ہے کہ اس پر قرآنی آیات کی صداقت کو پرکھا جائے یا اس پر

قرآن کا اس درجہ انطباق کیا جائے کہ یہ کتابِ الٰہی علوم و فنون کی دائرۃ المعارف سمجھی جانے لگے اور ان پر وقت متبدل افکار کی زد میں نعوذ باللہ قرآنی صداقت بھی آ جائے۔

علوم و فنون کے سلسلہ میں قرآنی موقف کے تئیں علماء و مفسرین افراط و تفریط کا شکار نظر آتے ہیں۔ ایک طرف مفسرین کا وہ طبقہ ہے جو جدید ماحول کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر محض تفسیر و تشریح میں لگا ہوا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ سائنس اور عمرانیاتی علوم نے ارتقائے اسلام کی راہ میں کیا کانٹے کھڑے کئے ہیں اور ان سے کیسے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔ اس دور میں ازہر کا یہی موقف تھا جس کے خلاف جمال الدین افغانی اور سید محمد عبدہ وغیرہ کو تحریک چلانی پڑی۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو ہر نئے نظریہ کو قرآن سے ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ڈارون کا نظریہ ارتقا سامنے آیا تو یہ لوگ قرآن سے اس کی تائید میں دلیلیں دینے لگے۔ مارکس کے معاشی فلسفوں کی حمایت میں انھوں نے اسلامی سوشلزم کا نظریہ پیش کیا۔ ہٹلر اور مسولینی کی حاکمیت و اقتدار کو دیکھ کر انھیں قرآن کا اصل مخاطب گردان لیا۔ گاندھی کے عدم تشدد کے غیر اسلامی نظریہ کی تائید میں انھوں نے جہادِ اسلامی کا چہرہ مسخ کر دیا اور اب سائنس کی ترقیوں سے مسحور ہو کر انھیں قرآنی آیات سے صحیح و درست ثابت کرنے لگے۔ افراط و تفریط کا یہ کھیل عالمِ اسلام میں جاری ہے لیکن سید قطب اس نقص سے پاک ہیں۔ سورہ بقرہ آیت ۱۸۹ کی تفسیر میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہمارے اس خیال کی مکمل تائید ہوتی ہے۔[۴۴] قرآن کہتا ہے:

يسألونك عن الأهلة قل هي مواقيت للناس والحج۔ (البقرہ۔ ۱۸۹)
(اے نبیؐ! لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو: یہ لوگوں کے لئے تاریخوں کی تعیین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔)

مصنف اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے کی مختلف صورتوں کے متعلق کیا گیا تھا لیکن جواب یہ دیا گیا کہ یہ لوگوں کے فوائد اور حج کے اوقات ہیں۔ انہی سے لوگوں کے روزہ و افطار، نکاح و طلاق و عدت، معاملاتِ تجارت و حسابات سب انھی تاریخوں کے ذریعے طے پاتے ہیں، اور حج بھی اسی سے انجام پاتا ہے یعنی دین و دنیا کے سارے معاملات انھی تاریخوں کے ذریعہ انجام پذیر ہوتے ہیں۔ یہاں جواب میں چاند کی تخلیق، نظامِ شمسی میں اس کا وظیفہ، اجرامِ سماوی کی حرکت کو متوازن رکھنے میں اس کا کردار وغیرہ فلکیاتی و سائنسی بحثیں نہیں چھیڑی گئیں کیونکہ یہ قرآن کے مخصوص مزاج، مخصوص اسلوب، انھیں

مخصوص نظام اور مخصوص معاشرہ کی تشکیلی جدوجہد کے خطوط تھیں۔ قرآن کا مقصد تو اس سرزمین میں ایک ایسی امت برپا کرنا ہے جو انسانیت کی قیادت میں مؤثر کردار ادا کرے۔ ایک مخصوص طرز زندگی اور مخصوص طرز معاشرت کا قیام اس کا مقصود ہو تاکہ اس نظام کے اصول و مبادی اس سرزمین پر جاری ہو سکیں۔ اور انسانوں کی ابدی طرف رہنمائی کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورتحال میں اس قسم کا معقول جواب کیسے دیا جا سکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان کا متاثر کن بحثوں سے اعراض کیا کہ انسانیت اپنی صلاحیت اور ماحولی استعداد کے لحاظ سے ان چیزوں کو سمجھنے کی اہل نہ تھی اور قرآن جس عظیم مقصد کے لئے نازل ہوا تھا اس کی راہ میں یہ بحثیں کچھ زیادہ سود مند نہ تھیں۔ قرآن فلکیاتی علم، کیمیا یا طب کی کتاب نہیں ہے بلکہ ان علوم سے کہیں بلند علم وہ انسانیت کو دینا چاہتا ہے۔ یہ محض جرات و جسارت نا زیبا ہے کہ قرآن میں ان علوم کا سراغ لگایا جائے یا ان کی مخالفت کے لئے قرآنی آیات کو استعمال کیا جائے۔ یہ دونوں صورتیں دراصل اس کتاب کے مزاج، اس کے مقصود اور دائرہ کار کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں۔ اس کا دائرہ انسانی زندگی اور نفس انسانی ہے اور اس کا نصب العین یہ ہے کہ وجود کی غرض و غایت کا ایک مخصوص تصور دے اور اس کا رشتہ اس کے خالق سے جوڑ دے اور اس تصور کی بنیاد پر زندگی کا ایک ایسا نظام قائم کرے جو انسان کو اپنی تمام صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا موقع عطا کرے۔ جس میں عقل و فہم کی صلاحیت بھی شامل ہے جسے اعتدال و توازن کے ساتھ تجربہ و تنقید کے ذریعہ جائز حدود میں استعمال کرنا ضروری ہے۔

قرآن کا موضوع خود انسان، اس کا تصور و اعتقاد، اس کے احساسات و افکار، اس کے اعمال و افعال اور اس کے روابط و تعلقات ہیں۔ لیکن مادی علوم اور مختلف وسائل و ذرائع کے ذریعہ عالم مادہ میں اکتشافات و ایجادات کی کوشش انسانی عقل اور اس کے تجربات و نظریات پر موقوف ہیں۔ اور قرآن صرف اتنا کرتا ہے کہ انسان کو ایک مخصوص نقطہ اور منفرد منہج دیتا ہے تاکہ انحراف و اختلال سے بچ کر وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں سے کام لے اور کائنات اور خالق کائنات کے سلسلہ میں مخصوص زاویہ نظر کو اپنا توشہ بنائے اور تفصیلات و جزئیات میں آزادانہ طور پر کام کرے۔

پھر سید قطب ان مبصرین پر تبصرہ کرتے ہیں جو افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

ان سادہ لوح لوگوں پر مجھے حیرت اور تعجب ہوتا ہے جو قرآن پر وہ چیزیں تھوپنے کی جسارت کرتے ہیں جن کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور وہ معانی و مفاہیم تراشتے ہیں جو اس کا مقصود نہیں ہوتے اور طب، کیمیا اور فلکیات وغیرہ علوم کی جزئیات و تفصیلات کا استخراج کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کوئی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں اور قرآن کا مقام بلند کر رہے ہیں۔ قرآن اپنے موضوع پر مکمل کتاب ہے اور اس کا موضوع ان علوم سے بہت بلند اور اعلیٰ ہے کیونکہ وہ انسان ہی ہے جو ان تمام علوم کا اختراع کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور تجربہ، بحث و تحقیق اور تنقید عقل انسانی کی خصوصیات ہیں اور قرآن اسی انسان کی شخصیت، اس کے ضمیر، اس کی عقل اور اس کی فکر کی تشکیل کرتا ہے۔ [۴۸]

قرآنی حقائق قطعی، مطلق اور آخری ہیں لیکن انسانی تحقیق کے نتائج نہ تو قطعی ہیں، نہ حتمی۔ یہ تو تجربات اور انکے حالات و وسائل کی محدودیتوں کا شکار ہیں اس لئے یہ طریق فکر اور طریق عمل کی غلطی ہوگی کہ قرآن کے حتمی، قطعی اور غیر قانونی حقائق کا غیر حتمی حقائق سے تقابل کریں۔ مصنف نے جدید نقطۂ نظر کے تین بڑے اسباب گنائے ہیں۔ [۴۹]

۱. اس غلط زاویہ کی پہلی وجہ وہ ذہنی انتشار اور اندرونی شکست ہے جو ہمارے علماء پر طاری ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سائنس ہی حافظ ہے اور قرآن اس کا تابع ہے چنانچہ وہ قرآن کو سائنس کے ذریعہ ثابت کرنا چاہتے ہیں جبکہ قرآن ہر حیثیت سے مکمل ہے۔

۲. خود قرآن کے مزاج اور اسکے وظیفہ عمل کے متعلق غلط فہمی عام ہے۔ قرآن حقیقی، حتمی اور آخری حقیقت ہے جو انسان کی تعمیر اس طرح کرتا ہے کہ اس عالم موجودات اور خدائی قوانین میں وہ کوئی تصادم محسوس نہیں کرتا بلکہ اس تصور قرآنی کے ذریعہ وہ کائنات کے اسرار و رموز سے آگاہ ہوتا ہے اور تجربہ و تحقیق سے اپنی خلافت میں راہ پانے وہ دونوں سے نقاب اٹھاتا اور ان سے کام لیتا ہے لیکن قرآن کا یہ وظیفہ بحیثیت عام مسلمانوں نے کھو دیا ہے۔

۳. تیسری وجہ قرآن کی معنوی اور تحریفانہ تفسیر ہے کہ مخصوص قرآن کو سائنس کی ترقیوں سے ہم آہنگ بنایا جائے۔

یہ ساری چیزیں قرآن کے جلال اور عظمت کے منافی ہیں۔

سید قطب اس امر کی تردید کرتے ہیں کہ سائنسی ترقیات سے چشم پوشی کر لی جائے اور فہم قرآن میں جدید نظریات و اکتشافات سے فیض نہ اٹھایا جائے جبکہ قرآن کا اعلان ہے کہ: سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق [۵۰] لیکن سوال یہ ہے کہ ان ترقیات سے استفادہ کس طرح

کیا جائے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مصنف قرآن کریم کی آیت وخلق کل شیء فقدرہ تقدیرا[۵۱]
سے بحث کرتے ہیں کہ آج سائنسی ترقیوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کائنات میں بڑی مہارت کے ساتھ نظم و نسق
اور توافق پایا جاتا ہے۔ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اور سورج متعین فاصلہ پر موجود ہے۔ چاند کا دائرہ عمل
متعین ہے اور سورج اور چاند کا حجم زمین کے حجم کے مقابلہ میں متعین ہے۔ ان سب میں ایک زبردست نظم و
ضبط کارفرما ہے جو کسی حادثاتی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ترقیاں اور مشاہدے بتاتے ہیں کہ اللہ نے ہر چیز
کی تخلیق متعین کی اور ہر ایک کا ایک اندازہ خاص رکھا۔ اس طرح کے مشاہدات اخذ کرنے اور ان سے استدلال
کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[۵۲]

(باقی آئندہ)

تعلیقات و حواشی

۳۷ مشاہد القیامۃ فی القرآن، دار المعارف مصر، ص ۸۰، ۹۔ ۳۸ نفس مصدر، ص ۱۲۔ ۳۹ یوسف العظم،
الشہید سید قطب۔ حیاتہ و مدرستہ و آثارہ، دار القلم بیروت ۱۹۸۰ء ص ۲۵۱۔ ۴۰ فی ظلال القرآن،
دار احیاء الکتب العربیۃ مصر، دوسرا ایڈیشن، الجزء الاول ص ۶۔ ۴۱ دیکھئے نفس مصدر، پہلا ایڈیشن،
۱۸۷-۱۸۳/۳۰

اس پارہ سے متعلق تمام اقتباسات مولانا سید حامد علی کے ترجمہ فی ظلال القرآن، ہندوستانی پبلیکیشنز
دہلی ۱۹۸۲ء سے ماخوذ ہیں۔ مولانا نے کوشش کی ہے کہ مصنف کی زبان آوری اور پرشکوہ اسلوب کو اردو کے
قالب میں ڈھال دیں جس میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اتنا اچھا ترجمہ آج تک راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔

۴۲ سید قطب، التصویر الفنی فی القرآن، نفس مصدر، ص ۱۰۵۔

۴۳ Mohd Qutb in the Shade of Quran, Taj Company Delhi,
(Preface P. X VII)۔ ۴۴ فی ظلال القرآن، محولہ بالا ۱/۲-۱۵۔ ۴۵ نفس مصدر
۲/۲۵-۲۶، پہلا ایڈیشن۔ ۴۶ نفس مصدر۔ ۴۷ نفس مصدر ۲/۴۰: ۴۱ دوسرا ایڈیشن
۴۸ نفس مصدر ص ۴۱۔ ۴۹ نفس مصدر ص ۴۲۔ ۵۰ القرآن الکریم، حم السجدہ ۵۳۔
۵۱ القرآن الکریم، الفرقان، ۲
۵۲ فی ظلال القرآن ۲/۴۲، ۴۳ (محولہ بالا)

اخبار علمیہ

محمد بن عبدالوہاب کی تفسیر سورۂ فاتحہ کی اشاعت اور اسکی تقسیم

سعودی عرب کے وزیر دفاع اور وزیر ہوا بازی الامیر سلطان بن عبدالعزیز نے محمد بن
عبدالوہاب کی تفسیر فاتحہ کو جیب خاص سے طبع کروایا ہے۔ یہ کتاب خاص طور سے
اداروں میں تقسیم کی جائے گی۔

اس کتاب کا مقدمہ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز نے لکھا ہے۔ تحقیق و
تعلیق کا کام دکتور فہد بن عبدالرحمٰن السروجی جو ریاض میں اساتذہ ٹریننگ کورس کے کلیہ
متوسطہ میں قرآنی تعلیمات کے صدر ہیں، نے کیا ہے۔ (اخبار العالم الاسلامی ۹ شوال ۱۴۰۸ھ ص)

"الادب الترکی الاسلامی" کے عنوان پر ایک بہترین کتاب

جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کے "مرکز البحوث" نے "مسلم گروہوں کے آداب"
پر کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلم گروہوں کے زبان و ادب اور ان
کے افکار و خیالات کو جاننے کے بعد ان کے اصل منبع یعنی اسلام اور اس کے آداب
اور اس کے افکار و خیالات سے انہیں قریب کیا جائے تاکہ اتحاد باہمی کی فضا قائم ہو اور
مسلمانانِ عالم متحد ہو سکیں۔

اس سلسلے کی پہلی کڑی ترکی اسلامی ادب کے موضوع پر لکھی گئی یہ کتاب ہے۔ اس کا
نام "الادب الترکی الاسلامی" ہے۔ اس کی تالیف دکتور محمد عبداللطیف ہریدی نے کی ہے
آپ ترکی زبان و ادب کے ماہر استاذ ہیں۔

اس سلسلے کی دوسری کتاب جلد ہی آنے والی ہے۔ اس کتاب کا نام ہوگا
"الادب الاسلامی باللغۃ الاردیۃ"۔

(اخبار العالم الاسلامی ۹ ا رجب ۱۴۰۸ھ صفحہ ۳)

مرتب

جامعہ کے لیل و نہار

جامعہ کے سلسلے میں مولانا مودودیؒ کی پیشنگوئی حرف بحرف صحیح

امسال جامعہ کے تمام ہی شعبہ جات میں غیر معمولی داخلے ہوئے ہیں۔ طلبہ وطالبات کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی ہے جس کی بنا پر متعلمین کے لئے جامعہ کے وسائل محدود اور ناکافی ہو گئے ہیں۔ طلبہ وطالبات کے سیکشنوں میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ جس سے درسگاہ اپنی وسعت کے باوجود تنگ دامنی کا شکار ہو گئی ہے۔ اب تعلیم دو شفٹوں میں ہو رہی ہے۔ ثانوی و اعلیٰ درجات کی تعلیم صبح کی آٹھ گھنٹیوں میں اور ابتدائی درجات کی تعلیم شام کی آٹھ گھنٹیوں میں ہو رہی ہے۔ طالبات کو ان کے گھروں سے لانے اور لے جانے والی بسوں کو اب دو دو چکر لگانا پڑتا ہے۔ جامعہ کا وسیع و عریض دارالاقامہ بھی ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ شعبۂ ابتدائی کی درسگاہ مکمل اب دارالاقامہ میں تبدیل ہو گئی ہے ڈائننگ ہال بھی اب نہایت تنگ ہو چکا ہے۔ طلبہ دو شفٹوں میں کھانا کھاتے ہیں حتیٰ کہ جامعہ کی بے انتہا کشادہ مسجد بھی اب تنگ ہوتی نظر آرہی ہے۔ مولانا مودودیؒ کی پیشن گوئی اس وقت بالکل صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ آپؒ نے کہا تھا "جامعۃ الفلاح کے مؤذن نے "حی علی الفلاح" کی آواز اس زور سے لگادی ہے کہ نمازیوں کی کثرت سے شاید جامعہ کو تنگ دامنی کی شکایت کرنی پڑے"۔

جامعہ میں اس وقت فوری عمارت کی شدید ضرورت ہے۔ اسکے لئے کارکنان جامعہ اور اراکین جامعہ جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات قبول فرمائے اور طلبہ وطالبات کی تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر نظم فرمائے تاکہ وہ اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت دین کا فریضہ بطریق احسن انجام دے سکیں۔

جناب مولانا رحمت الاثری صاحب فلاحی کی آمد بحیثیت استاذ

بڑی خوشی کی بات ہے کہ

استاذ محترم جناب مولانا رحمت الاثری صاحب فلاحی بحیثیت استاذ جامعہ تشریف لاچکے ہیں۔

آپ نے جامعہ سے فراغت کے بعد تقریباً آٹھ سال تک بحیثیت استاذ اور محرر کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اسکے بعد بغرض تعلیم مزید آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ میں آپ نے بی۔ اے میں داخلہ لیا اور وہیں سے ماجستر (ایم۔ اے) بھی مکمل کیا۔ آپ کے ماجستر کی تعلیم کا موضوع تھا "ابوہریرۃ تاریخ جہاد وعقائد" یہ تعلیم فل اسکیپ سائز کے ۳۸۴ صفحات پر مشتمل تھی۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام لوگوں کو مولانا سے بیش از بیش استفادہ کا موقع دے۔ آمین۔

لائبریری کلیۃ البنات کو انجمن طلبۂ قدیم کی جانب سے چند اہم تفاسیر کا ہدیہ

کلیۃ البنات کی لائبریری کو انجمن طلبۂ قدیم نے مندرجہ ذیل تفاسیر بطور ہدیہ پیش کیا ہے۔ تفہیم القرآن مکمل، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ تدبر قرآن مکمل، مولانا امین احسن اصلاحی۔ سیرۃ النبی مکمل، مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ اللہ تعالیٰ ان کتابوں سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جناب ماسٹر عبدالمالک صاحب جامعہ واپس آگئے

جناب رفیق الدین صاحب ہیڈ کلرک دفتر نظامت کے جانے کے بعد اب تک یہ جگہ خالی تھی۔ بحمداللہ مجلس عاملہ کی کوششوں سے استاذ محترم جناب ماسٹر عبدالمالک صاحب نے اپنی تشریف آوری سے یہ کمی پوری کردی ہے۔ آپ نے ۲۲؍جون ۱۹۸۸ء سے باقاعدہ کام شروع کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید قوت اور صلاحیت دے۔ آمین۔

صدر ایس۔ آئی۔ او جناب پی۔ سی۔ حمزہ صاحب کا طلبہ سے خطاب

صدر S.I.O جناب پی سی حمزہ صاحب ۲۰؍جون کو جامعہ تشریف لائے۔ آپ کے ہمراہ جناب طارق فاروق الیٹ صاحب فلاحی صدر S.I.O یوپی زون بھی تھے۔ یکم جولائی ۱۹۸۸ء کو بعد نماز عشاء جمعیۃ الطلبہ نے آپ کا پروگرام مسجد میں رکھا۔ تلاوت کلام پاک اور ترانہ کے بعد سکریٹری جمعیت نے جمعیۃ الطلبہ کا مختصر تعارف کرادیا۔ اس کے بعد حمزہ صاحب نے انگریزی زبان میں طلبہ سے خطاب فرمایا جس کی ترجمانی جناب طارق فاروق الیٹ صاحب فلاحی نے کی آپ نے اپنی تقریر میں کہا "جامعۃ الفلاح ہندوستان کی ایک ممتاز دینی درسگاہ ہے"

اسے دیکھنے کی تمنا مجھے کافی دنوں سے تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آج یہ تمنا پوری ہوگئی۔ آپ کا یہ جامعہ اپنی نوعیت کا منفرد جامعہ ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کے مقاصد میں تحریک اسلامی کے لئے افراد فراہم کرنا بھی شامل ہے۔ آپ یہاں دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کا بھرپور مطالعہ کیجئے اور ساتھ ہی ساتھ آپ ہر اس چیز کو اختیار کرنے اور سیکھنے کی کوشش کیجئے جس سے دین کی خدمت ہو سکتی ہے تاکہ آپ یہاں سے نکلنے کے بعد دین اسلام کے بہترین داعی بن سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام کو علم دین سیکھنے، اس پر عمل کرنے اور بندگانِ خدا تک اسے پہونچانے کی توفیق دے۔ آمین۔

طلبہ کی کثرت سے جامعہ میں تیئس اساتذہ کی ضرورت

طلبہ وطالبات کی کثرت کی بنا پر بیشمار سیکشنوں کی تشکیل عمل میں آئی ہے جس کے لئے موجودہ اساتذہ ناکافی ہیں۔ لہٰذا طلبہ وطالبات کے جملہ شعبہ جات کے لئے مزید تیئس اساتذہ کی ضرورت ہے۔ درخواست ارسال کرنے کی آخری تاریخ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۸ء تھی۔ اچھی خاصی تعداد میں درخواستیں دفتر نظامت میں پہونچ چکی ہیں۔ دعا ہے کہ جامعہ کو باصلاحیت اساتذہ مل سکیں۔

عیدالاضحیٰ کی تعطیل

عیدالاضحیٰ کی تعطیل بہت قریب آچکی ہے۔ یہ تعطیل ۷ر ذوالحجہ تا ختم ۱۳ر ذوالحجہ ہو رہی ہے۔ ۱۴ر ذوالحجہ سے جامعہ دوبارہ کھل جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

جامعہ کے کتب خانے میں مزید کچھ کتابیں

چند دنوں قبل جامعہ کے کتب خانے میں مختلف فنون پر چوراسی کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ چند قابل ذکر کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

الموسوعۃ الفقہیۃ، تجدید اصول الفقہ الاسلامی، تاج العروس، العبر فی خبر من غبر، مجالس العلماء، کتاب الانوار و محاسن الاشعار، مقالات فی احواس و

مسائل الطب، مآثر الانافۃ فی معالم الخلافۃ، معاجم علمی الموضوعات، معجم الالفاظ المفسرۃ فی کتاب الأغانی وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام لوگوں کو ان کتابوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق دے۔ آمین۔

جمعیۃ الطلبہ کی لائبریری میں کچھ نئی کتابوں کا اضافہ

ابھی حال ہی جمعیۃ الطلبہ کی لائبریری میں ۷۵ کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ چند اہم کتابیں یہ ہیں:

انشورنس اسلامی معیشت میں۔ کامریڈ کیا چاہتا ہے۔ آواگمن کا تحقیقی جائزہ۔ تاریخ الامت اول تا چہارم۔ اقبال جادوگر۔ تعلیم اور رہنمائی۔ دنیا کے بڑے مذہب۔

مولانا ازہد مدنی کی آمد

شیخ الحدیث حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے مولانا سید محمد ازہد مدنی اور مولانا مفتی محمد راشد صاحب اعظمی جناب تابش مہدی صاحب سے بغرض ملاقات جامعہ تشریف لائے۔ آپ دونوں حضرات جامعہ حسینیہ جونپور میں استاذ ہیں۔ راشد صاحب وہاں کے باضابطہ مفتی بھی ہیں۔ سکریٹری جمعیۃ الطلبہ کی خواہش پر جمعیۃ کی لائبریری اور جامعہ کے مختلف شعبوں کا مشاہدہ کیا۔

دونوں حضرات نے جمعیۃ کے کاموں کی تحسین کرتے ہوئے جمعیۃ و جامعہ کے لئے دعائے ترقی و استحکام فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔ آمین۔ •••

مضمون نگار حضرات اپنے مضامین خوشخط اور ورق کے ایک طرف تحریر فرمائیں

ہم ہر مسلمان سے درخواست کرتے ہیں کہ قرآن کریم کا کچھ نہ کچھ حصہ روزانہ ترجمے کے ساتھ پڑھنے کی عادت ڈالے اگر آپ نے یہ عادت ڈال لی تو آپ کو محسوس ہوگا کہ دل کی حالت اور کیفیت بدل رہی ہے۔ دل کا زنگ دور ہوگا اور دل ایمان کی مٹھاس محسوس کرے گا۔ اخلاص کے ساتھ قرآن و سنت پر عمل کرنے میں ہی ہماری کامیابی ہے۔

ہندوستان میں سیکڑوں مدارس میں لاکھوں بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں ان میں زیادہ تر بچے حفظ کر کے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے اہل مدارس کے لئے ضروری ہے کہ خواہ ناظرہ پڑھنے والے بچے ہوں یا حفظ کرنے والے بچے ہوں ہر ایک کو قرآن مجید با ترجمہ پڑھایا جائے اور اس کی اہمیت کا احساس دلایا جائے اور ان کے دلوں میں ایسا شوق پیدا کیا جائے کہ جب بھی تلاوت کریں سمجھ کر کریں۔ اسی سے نزولِ قرآن پاک کا اصل مقصد پورا ہوگا اور عمل کا جذبہ پیدا ہوگا۔ ساتھ ہی بچوں کو ضروریاتِ دین سکھانا ہم پر فرض ہے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں مساجد میں دینی تعلیم دینے کا رواج تھا پھر کیوں نہ ہم اس سنت کو زندہ کر کے اجر بھی حاصل کریں اور اپنے بچوں کو ضروریاتِ دین سکھانے کا فریضہ بھی ادا کریں۔ مسجد کے ٹرسٹی حضرات جس طرح امام، مؤذن، خادم، پانی، دری، بجلی وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں اسی طرح مسجد میں بچوں کے لئے صبح و شام ایک ایک گھنٹہ تعلیمی مکتب اچھی نگرانی میں چلائیں اور کوشش کریں کہ محلہ کا کوئی بچہ یا بچی ضروریاتِ دین کی تعلیم سے محروم نہ رہے۔

اس مکتب کا نصاب مختصر اور آسان ہونا چاہئے۔

(۱) عربی اور اردو کا قاعدہ (۲) عم کا پارہ (۳) تعلیم الاسلام کے دو حصے۔

(۴) عم کا پارہ یاد اور پوری نماز ترجمے کے ساتھ ہی سکھلائی جائے تاکہ بچپن ہی سے بچوں کے ذہن نشین ہو جائے کہ قرآن پاک سمجھ کر پڑھنے کی کتاب ہے۔ چھ سال تک اور چھ سال سے بڑے لڑکے لڑکیاں شریک کی جائیں، لڑکیاں دس سال سے اوپر کی نہ ہوں۔

قرآن کریم کی تلاوت پر جس قدر ثواب ملتا ہے اس سے بہت زیادہ ثواب سمجھ کر پڑھنے پر ملتا ہے۔ بہت سے ہم لوگ اس سے محروم ہیں۔ اسلئے عہد کیجئے کہ ہم روزانہ انشاءاللہ کچھ نہ کچھ کلام مجید کا حصہ ترجمے کے ساتھ پڑھیں گے۔ اس کو معمول بنا لیجئے اور پھر دیکھئے اس کی برکتیں۔

جامعۃ الفلاح

آپ کی خصوصی توجہ کا طالب ہے

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ——— برصغیر ہند میں جامعۃ الفلاح اپنے طرز کا ایک منفرد ادارہ ہے جس نے ایک ایسے نصابِ تعلیم کی داغ بیل ڈالی جو قدیم و جدید علوم کا حسین امتزاج ہو اور جس میں قرآن مجید کی تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ انہی خطوط پر جامعہ گامزن ہے ابتداء ہی سے تعلیم کے ساتھ تربیت کی طرف یہاں خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

جامعہ کی انہی خصوصیات کی بنا پر ملک کے طول و عرض سے ہر سال سیکڑوں تشنگانِ علم طلبہ و طالبات داخلہ کی خواہش لے کر جامعہ حاضر ہوتے ہیں۔ ملت کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر گنجائش سے کہیں زیادہ داخلے لینے پر ذمہ داران جامعہ مجبور ہوتے ہیں۔ طلبہ و طالبات کی تعداد تیزی کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے گزشتہ سال جامعہ میں زیر تعلیم طلبہ و طالبات کی تعداد ۲۹۷۲ تھی اور امسال یہ تعداد تقریباً چار ہزار تک پہنچ گئی ہے جس کی وجہ سے جامعہ وسائل کی شدید کمی سے دوچار ہے۔ کلاسیز، ہاسٹل، ڈائننگ ہال اور مسجد خصوصاً شعبۂ نسواں والا احاطہ ہاسٹل اور درسگاہ کی شدید تنگی سے دوچار ہے جہاں موجودہ عمارت دن میں درسگاہ اور رات میں ہاسٹل کا کام دیتی ہے۔ اسی طرح سے شعبۂ طلبہ و طالبات کے دونوں ہی شعبے میں مجبوری صورت سے دو شفٹ میں تعلیم ہو رہی ہے جس کی وجہ سے تعلیمی اوقات کم کرنے پڑ گئے ہیں۔

اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ جامعہ کے تعمیری منصوبے جلد از جلد مکمل کئے جائیں، تعلیم و تربیت کے نظام کو معمول پر لانے کیلئے فوری طور پر درسگاہ و ہاسٹل کی تعمیر ازحد ضروری ہے جس کے لئے دس لاکھ روپے کی فوری ضرورت ہے۔ ہمدردانِ جامعہ سے پوری توقع ہے کہ اس کارِ خیر میں پوری دلچسپی لیں گے اور مطلوبہ سرمایہ کی فراہمی میں دل کھول کر حصہ لیں گے اور اپنا اور اپنے متعلقین کا تعاون حاصل کر کے ناظم جامعہ کے نام جلد از جلد بھیجنے کی کوشش کریں گے۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

(ناظم جامعہ)